www.urducouncil.nic.in

قیمت: -/10 ₹

آدھی آبادی کے جذبات واحساسات کا ترجمان

ماہنامہ

خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly , New Delhi

دسمبر 2018

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

کے لیے اردو کی تاریخ کا سب سے خوب صورت، خوب سیرت شاندار رسالہ

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ

بچوں کی دنیا

دہلی

Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

دل چسپ کہانیاں
معلوماتی مضامین
ہنسنے ہنسانے کی باتیں

پیاری پیاری نظمیں
قسط وار ناول

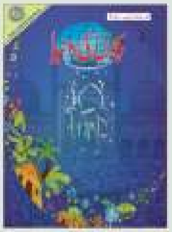

ان کے علاوہ:

کہکشاں ♦ سیاحتی مقامات

اردو فیس بک ♦ دماغی ورزش

ننھے فنکار ♦ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

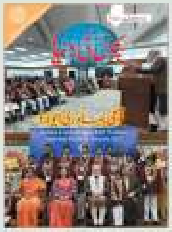

سب سے زیادہ چھپنے والا بچوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 10 روپے   سالانہ: 100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in
شاخ: 110-7-22 تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

اردو آبادی کے جذبات و احساسات کا ترجمان
ماہنامہ
خواتین دنیا
Mahnama Khawateen Duniya Monthly, New Delhi

جلد: 2 شمارہ: 12 دسمبر 2018

مدیر اعلیٰ: ڈاکٹر شیخ عقیل احمد
مدیر منتظم: ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی
نائب مدیر: ڈاکٹر عبدالحی

ناشر اور طابع:

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند
مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا فیز-II، نئی دہلی۔ 110020
مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل
قیمت -/10 روپے، سالانہ -/100 روپے
صفحات: Total Pages 64

■ قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل (NCPUL) اوراس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
● ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا
جسولہ، نئی دہلی-110025، فون:49539000
نگارشات ارسال کرنے کے لیے
ای میل: kduniya@ncpul.in
editor@ncpul.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7
آر کے پورم، نئی دہلی۔110066
فون: 26109746، فیکس:26108159
ای میل: sales@ncpul.in,ncpulsaleunit@gmail.com
شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002
فون: 24415194 - 040

اس شمارے میں

اداریہ	مشعل	مدیر	4
روبرو	بلقیس ظفیر الحسن	ڈاکٹر نشاں زیدی	5
شخصیت	امرتا پریتم: میں نے خاموشی کے پیڑ سے......	ڈاکٹر جی۔ ایم۔ پٹیل	9
نکہت سخن	شاعرات کے منتخب اشعار		12
جہان نسواں	قدسیہ زیدی	صالحہ عابد حسین	13
	صغرا مہدی کا ناولٹ	محمد نوشاد عالم	19
	اردو شاعری کی نمائندہ تانیثی آوازیں	نیلوفر یاسمین	23
	بیسویں صدی کی نسائی آواز۔۔ پروین شاکر	حارث حمزہ لون	26
کہانیاں	دیوتا اور مندر	شیریں نیازی	31
	آسمان روتا کیوں ہے	ڈاکٹر حسام الدین فاروقی	34
	چاند گرہن	عشرت ناہید	35
	مٹی کی خوشبو	ڈاکٹر قدسیہ نصیر	39
	شہادت	صالحہ صدیقی	42
	ماضی کے سائے	انزیلہ انصاری	48
حسن سخن	ماہ لقا چندہ، بلقیس ظفیر الحسن، ڈاکٹر مینا نقوی، طلعت جہاں سروہہ		50
باورچی خانہ	لذیذ پکوان		53
صحت	زیکا وائرس	نسیم سعید	55
آرائش وزیبائش	حسن کی نگہداشت		57
تاثرات	نگر نگر سے		59
خواتین خبرنامہ			61

مشعل

’خواتین دنیا‘ ایک سال سے زائد عرصے سے پابندی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔اس اثناء میں ’خواتین دنیا‘ نے جس قدر بھی ترقی کی ہے، وہ قارئین کی رہین منت ہے۔ آدھی آبادی کے جذبات واحساسات کی ترجمانی کرنے والا یہ رسالہ طبقۂ نسواں کے جذبات کا مظہر ہے۔اس رسالے کے ذریعے خواتین اپنی تخلیقات کو منظر عام پر لانے کی کوشش کر رہی ہیں۔یہ حقیقت ہے کہ اردو ادب کی آبیاری کرنے میں خواتین نے بھی اہم رول ادا کیا بھلے ہی ان کی شمولیت پہلے کم رہی ہو لیکن آج وہ ادبی منظر نامے پر اپنی پہچان بنانے میں کامیاب ہو چکی ہیں۔

عالمی منظر نامے پر اگر نظر ڈالی جائے تو خواتین کی شمولیت ہر میدان میں نظر آتی ہے۔قدیم قصوں اور کہانیوں کو غور سے پڑھا جائے تو وہاں بھی عورت کا وجود نظر آتا ہے۔ نیرنگئ زمانہ کے اعتبار سے عورت کے کئی روپ ہمارے سامنے آتے ہیں۔اس بات سے بھلا کس کو انکار ہو سکتا ہے کہ فی زمانہ زندگی کے تمام میدانوں میں اس نے اپنی شناخت قائم کی ہے۔اس کے باوجود آج بھی کئی شعبوں میں وہ زبوں حالی وپسماندگی سے دوچار ہے۔

مرد اساس معاشرے میں خواتین کی تخلیقات کو اکثر نظر انداز کر دیا جاتا ہے یا ان کو سرے سے ہی خارج کر دیا جاتا ہے جبکہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ خواتین کے جذبات واحساسات کا بیان وہ خود جس طریقے سے کر سکتی ہیں مرد قلم کار اس طرح نہیں کر سکتے۔ ’خواتین دنیا‘ کے ذریعے خواتین قلمکاروں کی حوصلہ افزائی کی جا رہی ہے۔ایسی بہت سی خواتین بھی موجود ہیں جو پڑھنے لکھنے کا ذوق رکھتی ہیں اور ان کی تحریروں میں گہرائی اور گیرائی کے ساتھ ساتھ ایک فکر بھی موجود ہوتی ہے۔اس رسالے میں شامل زیادہ تر مضامین خواتین کے ارد گرد کی زندگی اور ان کے گرد و پیش کا پتہ دیتے ہیں۔

خواتین تخلیق کاروں میں بہت سی ایسی ہستیاں بھی ہیں جو اپنی فنی مہارت سے لوگوں کے دلوں پر قابض ہوئیں۔ایسی ہی دو عظیم شخصیتیں قدسیہ زیدی اور صغرا مہدی ہیں۔قدسیہ زیدی اردو ادب کی دنیا میں ڈرامہ نگار کی حیثیت سے جانی جاتی ہیں۔ان کی شخصیت کے کئی پہلو تھے۔قدسیہ زیدی ملنسار خاتون ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت ذہین تھیں اور اپنے مقصد کے حصول میں ہمیشہ کوشاں رہتی تھیں۔ایک طرف تو وہ نہایت دردمندانہ دل رکھتی تھیں اور دوسری طرف ذرا سی ناانصافی بھی انھیں گوارا نہیں تھی۔قدسیہ زیدی بہت بے باک خاتون تھیں۔ ہندوستانی تھیٹر کو انھوں نے جو بلندی عطا کی وہ قابل تعریف ہے۔اگر چہ ان کی اپنی زندگی تلخ تجربات سے نہیں گزری تھی، تاہم دوسروں کی زندگی کے نشیب وفراز کو بہت قریب سے دیکھا تھا جن کو انھوں نے اپنی تخلیقات میں پیش کیا۔

اردو حلقوں میں صغرا مہدی کی شخصیت بھی کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ابتدا میں انھوں نے ناول نگاری کی طرف زیادہ توجہ کی اور اپنے قلم سے اس صنف کو وقار بخشا۔جامعہ ملیہ اسلامیہ میں درس وتدریس کے ساتھ ساتھ انھوں نے سماجی، تہذیبی اور تعلیمی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیا۔ان کے مطالعے کے شوق نے ان کے فن کی آبیاری کی۔انھوں نے لکھنے کے ساتھ ساتھ دیگر مصروفیات میں بھی حصہ لیا۔قرۃ العین حیدر سے وہ بہت زیادہ متاثر نظر آتی ہیں۔صغرا مہدی نے عورت کی زندگی میں درپیش سیاسی، معاشی، مذہبی مسائل پر بحث کی ہے اور خواتین سے جڑے ہوئے اہم پہلوؤں کو بروئے کار لانے کی کوشش کی ہے۔ان کا زور اس بات پر زیادہ تھا کہ عورت کو اپنے عورت ہونے پر فخر اور ناز ہونا چاہیے۔انھوں نے اس بات کی طرف بھی زیادہ توجہ دی کہ عورت کو سماجی اور سیاسی کاموں میں مکمل آزادی حاصل ہونی چاہیے جہاں وہ کھل کر اپنے جذبات کا اظہار کر سکے اور اپنی زندگی اپنی مرضی سے گزار سکے۔

ان دونوں عظیم ہستیوں پر اس شمارے میں مضامین شامل ہیں۔ان کے علاوہ دیگر تخلیقات بھی لائق توجہ ہیں۔خواتین دنیا آپ کا رسالہ ہے۔لہٰذا ہمیں اپنے تاثرات اور مشوروں سے آگاہ کرنا نہ بھولیں۔آپ کے مشوروں کی روشنی میں ہم رسالے کو مزید بہتر بنا سکتے ہیں۔

آپ کا

ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

ڈاکٹر نشاں زیدی

بلقیس ظفیر الحسن

نام: بلقیس پروین (شادی سے پہلے رحمانی بانو کے نام سے لکھا)
والد کا نام: عنایت الرحمٰن عنایت مرحوم، شوہر کا نام: سید ظفیر الحسن مرحوم، پیدائش: 1/ ستمبر 1938، تعلیم: کوئی سند نہیں
تصانیف: گیلا ایندھن (شعری مجموعہ) 1996، شعلوں کے درمیاں (شعری مجموعہ) 2004
ویرانے آباد گھرانوں کے (افسانوی مجموعہ) 2008، مانگے کی آگ (ترجمہ افسانے) 2011، تماشہ کرے کوئی (ڈرامے) 2012
انعامات و اعزازات: بہار اردو اکیڈمی اور اتر پردیش اردو اکیڈمی نے مجموعہ 'شعلوں کے درمیاں' کو 2005 میں انعام سے نوازا۔
دہلی اردو اکادمی نے 'مانگے کی آگ' کو 2005 میں ایوارڈ برائے ترجمہ سے نوازا۔
پیش ہے بلقیس ظفیر الحسن سے کیے گئے انٹرویو کے اقتباسات:۔

سوال: میں آپ سے آپ کی ادبی زندگی سے متعلق چند سوال کرنا چاہوں گی۔

جواب: میں بہت ہی واہیات سی عورت ہوں، کچھ کرنا دھرنا آتا نہیں ہے، کچھ شاعری واعری کر لیتی ہوں اب تو وہ بھی نہیں کرتی ہوں، آپ جو آج کل کتابیں پڑھ رہی ہوں گی، وہ میری پہلے کی لکھی ہوئی چیزیں ہیں یعنی 2005 وغیرہ میں انعامات ملے تھے۔

سوال: تیری تو بلقیس نرالی باتیں ہیں
اس دنیا میں کیسے ترا گزر ہوگا
مطلب آپ کا شعر آپ کی زندگی کا عکاس ہے؟

جواب: ہاں میری طبیعت کی وجہ سے میرا اس دنیا میں رہنا مشکل بنا ہوا ہے۔ ویسے اب تو ماشاء اللہ بچے بڑے ہو گئے ہیں، اپنے اپنے کام سے لگ گئے ہیں لیکن جب پڑھنے کی خواہش تھی میرے پاس وقت نہیں تھا اور اب میرے پاس جب وقت ہے تو لکھنے پڑھنے کی صلاحیت کم ہو گئی ہے۔ میرے اوپر فیمنسٹ ہونے کا جو ٹھپہ لگایا گیا ہے میں فیمنسٹ نہیں ہوں۔ کیونکہ میں آپ کو بتا دوں کہ میں جانتی ہوں عورت جب ستم ڈھانے پر آتی ہے نا اس کے مقابلے میں تو مرد کچھ نہیں ہے۔

سوال: میم آپ کا تعلق کہاں سے ہے؟

جواب: میری پیدائش بہار میں ہوئی ہے۔ میرے ابا عنایت الرحمٰن عنایت تھے اور آپ نے ڈاکٹر شکیل الرحمٰن کے بارے میں سنا ہوگا وہ میرے چچا تھے۔

سوال: جس قصبہ سے آپ کا تعلق ہے جب آپ نے آنکھ کھولی اور آپ میں تھوڑی سمجھ آئی تو وہاں کا ماحول کیا تھا خصوصاً لڑکیوں کے لیے کیا حالات تھے۔ ان کی تعلیم کے متعلق کچھ بتائیں۔

جواب: میرا خاندان ادبی ماحول والا ہے جب سے میری آنکھ

کھلی ادبی ماحول دیکھا۔ ابا میرے بہت اچھے رائٹر ہوا کرتے تھے اپنے وقت کے عنایت الرحمٰن عنایت۔ انھوں نے شاعری بھی کی اور افسانے بھی لکھے۔ بیٹے کے انتقال کے بعد وہ اتنا دکھی ہوئے کہ شاعری واعری سب چھوڑ دی اور پھر صرف نعت کہنے لگے اور مذہبی شاعری کرنے لگے۔ ابا جوڈیشیل سروس سے تعلق رکھتے تھے لیکن بہار ودھان سبھا میں دس بارہ سال خدمات بھی انجام دیں۔ شکیل الرحمٰن میرے سب سے چھوٹے چچا تھے۔ وہ متھلا یونیورسٹی میں وائس چانسلر تھے۔ ابا میرے جج کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ چونکہ گھر میں شاعرانہ ماحول تھا ہر آدمی کچھ نہ کچھ کہنے میں لگا رہتا تھا اثر تو پڑنا ہی تھا۔ بارہ تیرہ سال کی عمر میں غزل لکھی اور ابا کے پاس لے کر گئی تو ابا دیکھ کے ہنسنے لگے۔ بولے بیٹی دیکھو ایسا ہے تم لکھنا چاہتی ہو تو کہانیاں لکھو مضامین لکھو تو اچھا لگے گا شاعری مت کرنا۔ ہم سعادت مند بیٹی کی طرح مان گئے اور ہم نے کہانیاں لکھنا شروع کیں۔ یعنی میری شادی اٹھارہ سال کی عمر میں ہوئی اس وقت میں شمع میں چھپ چکی تھی۔ شمع میں میری کہانی چھپی تھی میں نام بھی بھول گئی۔ شادی کے بعد روزگار کے سلسلہ میں یہاں وہاں پھرتے رہے سروس بھی ایسی تھی شوہر کی کہ کلکتہ میں رہے، کبھی ممبئی میں رہے، پونا میں رہے اور پھر دلی آ گئے۔

اب ہم سے کوئی پوچھے کہ ہم کہاں کے ہیں تو ہمیں نہیں معلوم کہ ہم کہاں کے ہیں۔ کسی نے ہم سے پوچھا کہ آپ کہاں کی رہنے والی ہیں تو ہم نے کہا کہ اب تو ہم کہیں کے نہیں رہے۔ بس یہی حال ہے ہمارا۔ یہ جو تصور ہے کہ کون کہاں کا ہے یہ میرا پسندیدہ تصور نہیں ہے، آپ کیا ہیں وہ ہیں آپ کہاں کی ہیں اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اس کی وجہ سے صوبائی جانبداری پیدا ہو جاتی ہے جو نہایت ناخوش گوار ہے میرے لیے۔

سوال: شادی کے بعد گھر کا ماحول کیسا رہا۔ آپ نے بچوں اور گھریلو کاموں سے وقت نکال کر اپنے تخلیقی سفر کو کس طرح جاری رکھا؟

جواب: شادی کے بعد گھر کا ماحول تو صحیح تھا۔ ساس سسر بھی نہیں تھے۔ لیکن شادی کے بعد بچوں کی پرورش میں لگ گئی اور یہ سلسلہ کئی برس تک جاری رہا۔ اب تو سب سیٹل ہو گئے ہیں۔ دو بیٹیاں ہیں میری اور چار بیٹے ایک بیٹے کا تو تین سال پہلے انتقال ہو گیا، جس کی وجہ سے میرا یہ حال ہوا ہے۔ میری بیٹی نغمہ ظفیر ذاکر حسین کالج میں انگریزی کی لیکچرر ہیں اور دوسری بیٹی دیبہ ظفیر بھی انٹر کالج میں انگریزی پڑھاتی ہیں۔ ایک بیٹا جو گزر گیا وہ اچھی سروس میں تھا۔ ایک بیٹا میرا جو میرے ساتھ رہتا ہے وہ بول اور سن نہیں سکتا وہ گورمنٹ پروجیکٹ میں کام کرتا ہے۔ ایک بیٹا اپنے بال بچوں سمیت آسٹریلیا میں ہے۔ یہ سب ہمارے حالات ہیں اور ان حالات سے گزرنے کے لیے لکھنا بہت ضروری تھا اور اگر میں نہیں لکھتی تو زندگی گزارنے میں بہت مشکل پیش آتی۔ اس لیے کہ سب کو دیکھنا بھی تو میرا ہی کام تھا۔ پھر 1995 میں میرے شوہر کا انتقال ہو گیا۔ میرے شوہر یوجنا میں چیف ایڈیٹر کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ اس وقت سے میں دہلی میں ہی ہوں۔ بس یہی ہے ہماری زندگی، لکھنا پڑھنا اسی میں جاری رکھا یعنی اپنے آپ کو زندہ رکھنے کے لیے لکھتے رہے۔ چھپنے کے لیے بھی بھاگ دوڑ نہیں کی۔ جب چھپ گیا خوش ہو گئے اور نہیں چھپا تو بھی واہ واہ۔ انعام وغیرہ سب ملا ہے۔ اردو اکادمی والوں نے میری بہت حوصلہ افزائی کی اردو اکادمی والوں کے تو ہم بہت ممنون ہیں، ان لوگوں نے ہم کو بہت آگے بڑھایا۔ 2004 کے بعد میرا لکھنا بالکل چھوٹ گیا کچھ لکھنے کے لیے دل ہی نہیں چاہتا تھا۔ اس کے بعد بنات سے نگار نے فون کیا کہا ہم آپ کو ادبی تنظیم میں رکھنا چاہتے ہیں۔

ہم نے کہا ہم تو بالکل نکمے آدمی ہیں ہم کو کہاں رکھو گی۔ ہم سے کچھ ہوتا تو ہے نہیں، تو کہنے لگیں کہ جانے دیجیے آپ کا نام ہی کافی رہے گا۔ ہم نے کہا جب ایسی بات ہے تو رکھ لو میرا نام۔ ہم کو خوشی ہو گی کہ کچھ کر نہیں رہے ہیں میرا نام ہی ہے۔

سوال: آپ کی اب تک کتنی کتابیں شائع ہوئی ہیں؟

جواب: میری اب تک پانچ کتابیں چھپی ہیں۔ گیلا ایندھن میری پہلی کتاب ہے۔ جو میری پہچان ہے۔ یہ 1996 میں شائع ہوئی۔

سوال: ہاں ''گیلا ایندھن'' کے بارے میں میں آپ سے بات کرنا چاہوں گی۔ یہ آپ کا شعری مجموعہ ہے اس کا انتساب مجھے بہت پسند آیا۔

''اپنی ماں اور ان تمام عورتوں کے نام جنھیں اپنی محنتوں کا صلہ جس کی وہ مستحق ہیں کبھی نہیں ملا۔''

اس کے پیچھے ایک درد ہے، کرب ہے اور ایک شکایت ہے۔ اس کے بارے میں آپ کچھ بتائیں۔

جواب: آپ کو میں بتاؤں میرے بھائی ماشاءاللہ بہت بڑے عالم فاضل ہوا کرتے تھے، ڈسٹرکٹ جج کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے ہیں۔ وہ انتساب دیکھ کر ہم سے خفا ہو گئے۔ یہ تم نے کیا کیا کہ میری ماں اور ان تمام عورتوں کے نام تم نے میری ماں کو بھی اس میں شامل کر دیا اور بہت خفا ہو گئے انھوں نے کہا نہیں پڑھیں گے تمھاری کتاب۔ ہم نے کہا مت پڑھو۔ لیکن میں نے عورتوں کا جو کرب محسوس کیا وہ لکھ دیا۔

لیکن میرے نام پر فیمنسٹ کا ٹھپا لگا ہوا ہے۔ میں فیمنسٹ

نہیں ہوں۔ اب کچھ زیادہ ہی ہوگیا ہے۔ لیکن میرے تجربے نے مجھے بتایا۔ میں تو بس اپنے آس پاس کے ہی ماحول کو دیکھتی تھی۔ لیکن اب ایسا لگتا ہے عورتیں بھی کم نہیں ہیں۔ جس کو جہاں موقع ملتا ہے وہ دبانے میں لگ جاتا ہے۔ بس یہی ہے ہماری داستان۔

سوال: آپ کے گھر کا ماحول ادبی تھا۔ آپ کے چچا ڈاکٹر شکیل الرحمٰن بڑے ادیب تھے۔ آپ کو گھر کے ماحول نے زیادہ متاثر کیا یا پھر سماجی مسائل سے متاثر ہو کر آپ نے قلم اٹھایا؟

جواب: دیکھیے گھر میں شعروشاعری ہوتی تھی۔ ہمارے ایک خالہ زاد بھائی تھے قیصر بھیا۔ قیصر بھیا کیمونسٹ تھے وہ سیاسی کتابیں لاکر پڑھاتے تھے اور کہتے تھے لو یہ پڑھو۔ اور گھر میں ادبی اور مذہبی ماحول تھا۔ لیکن میرا اس سے مختلف مزاج بننے لگا اور میں ان کی طرح سوچنے لگی تو میرا جو ترقی پسند رجحان تھا بننے لگا وہ گھر کے ماحول سے بالکل الگ تھا۔ گھر میں نہایت ہی ادبی اور مذہبی قسم کی شاعری ہوتی تھی۔ جب میں نے شعر لکھنے شروع کیے میرے شوہر سید ظفیر الحسن وہ بھی اچھے شاعر ہوا کرتے تھے، لیکن بہت بے پرواہ آدمی تھے یعنی بہت اچھا لکھتے تھے لیکن موڈ میں آیا تو لکھا نہیں تو چھوڑ دیا کسی کے لیے لکھ دیا یا کسی کا سہرا لکھ دیا۔ سہرا لکھنے والی شاعری مجھے آتی ہی نہیں اور جب میں یہ سب لکھنے لگی تو ایک دن بیٹی سے کہنے لگے تمھاری امی کو کیا ہوگیا ہے کیا لکھ رہی ہیں میں نے کہا بھئی جو محسوس کرتی ہوں وہ لکھ رہی ہوں۔

سوال: آپ کی تعلیم کیسے ہوئی؟

جواب: ہمارے بچپن میں وسائل بہت کم تھے۔ ہمارے ابا نے اسکول نہیں بھیجا۔ کیونکہ ان کا تبادلہ ہوتا رہتا تھا ہر جگہ لڑکیوں کا اسکول نہیں ہوتا تھا اور لڑکوں والے اسکول میں ابا بھیجنا نہیں چاہتے تھے۔ ہماری تعلیم ویسے ہی ہوئی میرے پاس کوئی سند نہیں ہے۔

سوال: لیکن بہت بڑی بات ہے کہ آپ نے گھر پر رہ کر سب کچھ لکھا اتنی زبانیں سیکھیں ترجمہ کیا۔

جواب: میں نے اپنے بچوں کی کتابوں سے پڑھا اور سیکھا ان کے ساتھ بیٹھ جاتی تھی پڑھنے کے لیے اور بس نکل گئی۔ بس انہی کے ساتھ تعلیم حاصل کی ہے۔ میں کہتی تھی تم کو پال کر بڑا کر دیا اتنا بھی نہیں کر سکتیں کہ ماں کی مدد کرو کا ہے کہ لیے تم کو اتنا پڑھایا بیٹا اب بھی اگر کوئی لفظ سمجھ میں نہیں آتا ہے تو میری بیٹی آرام سے بتاتی ہے۔

سوال: شادی کے بعد بھی لکھنے پڑھنے کا ماحول رہا۔

جواب: شادی کے بعد تو بہت عجیب ماحول رہا۔ میری سسرال میں ساس سسر کوئی نہیں تھے۔ میرے شوہر اپنے بل بوتے پر حاصل کرنے والے آدمیوں میں سے تھے۔ اور یہ بھی بات میں آپ کو بتا دوں کہ میری شادی میری اپنی مرضی سے ہوئی ہے۔ میں اہل سنت سے تعلق رکھتی ہوں اور میرے شوہر شیعہ تھے۔ لیکن ایسے شیعہ تھے کہ نہ ہم سنی معلوم ہوتے اور نہ وہ شیعہ یعنی کہ ہم لوگ بس مسلمان ہیں اللہ کا شکر ہے مسلمان ہیں۔ اور میری سسرال والے بھی اچھے ہیں اور مجلس وغیرہ میں جاتی ہوں تو بالکل محسوس نہیں ہوتا ہے کہ میں الگ ہوں۔

ہم نہ تھے بھٹکے جنگل جنگل
گھر گئے سب جاں سے نہ گزرے
کیا لکھیں اپنی بیتی
کوئی بات ہی اس میں
خاص نہیں ہے

بس گزر گئی زندگی اب بہت اچھا لگتا ہے کہ بنات والوں نے شامل کرلیا ہے پہلے تو میں بہت الجھن میں تھی۔ ہم کیسے کریں گے ہم کو تو آتا ہی نہیں ہے کہ کیسے بولا جائے کیسے کیا کیا جائے۔ اب تو ہمیں بڑا اچھا لگنے لگا ہے۔ ان کی گفتگو میں میں شامل تو نہیں ہوتی ہوں لیکن فورم پر ان لوگوں کا پورا پروگرام دیکھتی ہوں، بہت مزا آتا ہے۔

سوال: آپ کو کیا لگتا ہے کہ شاعری کے ذریعہ ایک مصنف اپنی بات زیادہ اچھے طریقہ سے کہہ سکتا ہے۔ یا پھر نثر یعنی افسانوی ادب کے ذریعہ سے مصنف اپنے جذبات کی عکاسی مؤثر طریقہ سے کر سکتا ہے۔

جواب: دیکھیے شاعری کا معاملہ ایسا ہے جو آپ لکھ رہی ہیں بھلے ہی وہ آپ کا ذاتی تجربہ نہ ہو لیکن پڑھنے والے یہی سوچتے ہیں کہ یہ ان کی آپ بیتی ہے، لیکن شاعری کا معاملہ یہ ہے کہ اس کو آپ کر نہیں سکتے ہیں یعنی جہاں تک میرا اپنا معاملہ ہے۔ روٹی بنا رہی ہوں ایک مصرعہ آیا ذہن میں کلنڈر پر لکھ لیا اور اٹھتے بیٹھتے اس کو پورا کر دیا اب ایک شعر ہوگیا تو بھیا دوسرا شعر بھی کہنا چاہیے اس طرح سے میں نے شاعری کی ہے۔ افسانوں کی بات ہے ہمارے دور میں خواتین کی جو ناگفتہ بہ حالت تھی۔ بڑے بڑے خاندان کی عورتیں گھٹ گھٹ کے جیتی تھیں اور اسی میں خوش تھیں۔ میں ان کو دیکھ کر باغی ہوجاتی تھی جل بھن کر خاک ہوجاتی تھی اور سوچتی تھی دیکھو نا کیسے لوگ ہیں۔ اور شعر اپنے آپ ذہن میں اپجنے لگے۔ سچ تو یہ ہے کہ میں نے شاعری نہیں کی بلکہ شاعری نے خود کو میرے ہاتھ سے لکھوایا ہے نہیں تو یہ سب میں نے لکھا نہیں ہے۔ ہاں کہانیاں میں نے لکھی ہیں۔ ابا کے کہنے سے شاعری تو چھوڑ دی تھی۔ افسانے میں نے

کوشش کر کے لکھے ہیں اور ترجمہ کرنا ہم کو بڑا اچھا لگتا ہے۔ میرے ابا بھی ترجمہ کرتے تھے اور مجھ سے بھی ترجمہ کرواتے تھے وہ بولتے تھے اور میں لکھتی جاتی تھی۔ یعنی ترجمہ مجھے بچپن سے ہی اچھا لگتا تھا۔ اب بھی ایسا لگتا ہے جب کوئی اچھی چیز سامنے آتی ہے۔ میں نے ایک کہانی ''پوتھی'' پڑھی تو مجھے لگا کہ میں اگر اس کہانی کو ترجمہ نہیں کروں گی تو پتہ نہیں کیا ہو جائے گا۔ اس کا میں نے ترجمہ کیا اور بعد میں پڑھا تو لگا واہ واہ میں نے کتنا اچھا ترجمہ کیا۔

سوال: آپ نے کئی اصناف میں طبع آزمائی کی نظمیں لکھیں، غزلیں لکھیں اور افسانے بھی لکھے لوگوں کا کیسا ریسپونس رہا؟

جواب: ریسپونس تو بہت اچھا رہا۔ ''گیلا ایندھن'' نے میری شخصیت بنادی۔ ''گیلا ایندھن'' کے بعد میرا نام لوگ جاننے لگے۔ یعنی میں اس وقت جو کچھ ہوں صحیح معنوں میں گیلا ایندھن کی وجہ سے ہوں۔ اس کے بعد میں نے ''شعلوں کے درمیاں'' بھی لکھی۔ میں شب خون میں بھی چھپتی رہی۔ اس وقت لوگ شب خون میں چھپنا بہت معیاری سمجھتے تھے۔ میں مستقل شب خون میں چھپتی رہی۔ میں شمس الرحمٰن فاروقی کی مشکور ہوں کہ انھوں نے اتنی ہم کو توجہ دی۔ میں شاعری کی وجہ سے ہی پہچانی گئی اور میرا ترجمہ بھی بہت اچھا ہے۔ لیکن میرے جو اپنے تخلیقی افسانے ہیں میں ان سے زیادہ خوش نہیں ہوتی ہوں۔ شروع شروع میں میں نے بڑے اچھے اچھے افسانے لکھے تھے۔

سوال: آپ نے بچوں کے لیے کہانیاں بھی لکھیں اور نظمیں بھی۔

جواب: میں نے ایسی کہانیاں لکھیں جو بارہ سال کے بچوں کے لیے ہیں یعنی بہت چھوٹے بچوں کے لیے نہیں لکھیں۔ بھالو اور ہاتھی والی کہانیاں تو بہت مل جاتی ہیں بچوں کو، لیکن بڑے بچوں کے لیے کہانیاں کم ہیں۔

سوال: آپ کی نظم میں نے پڑھی۔ ''اکیلا بچہ'' بہت مؤثر ہے۔ یہ ان بچوں کی عکاسی کرتی ہے جو اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہیں۔ اس کے بارے میں کچھ بتائیں۔

جواب: میرا پوتا ہے اس کے والدین دونوں آفس چلے جاتے ہیں۔ وہ میڈ کے حوالے رہتا ہے۔ اکیلے کھیلتے کھیلتے بور ہو جاتا ہے۔ میں جب پونا میں رہتی تھی تو وہ بہت خوش ہوتا تھا۔ اسی کو دیکھ کر وہ اکیلا بچہ ہمارا پوتا، یہ نظم لکھی۔

سوال: آپ کے نزدیک خواتین تخلیق کار اور مرد تخلیق کار میں کیا فرق ہے؟

جواب: یہ تو بالکل غلط بات ہے۔ یہ ختم ہو جانا چاہیے۔ یہ کیا ہے تانیثیت تانیثیت ادب تو ادب ہوتا ہے۔ تانیثی ادب کیا ہوتا ہے۔ اور ظاہر ہے ہر مصنف اپنے ماحول کے مطابق لکھتا ہے۔ اگر ہم عورتیں اپنے گھر کی عکاسی کرتی ہیں تو ان کی قدر کم نہیں ہو جاتی ہے۔ اب جیسے مسرور جہاں ہیں اپنے زمانے میں میں نے ان کی بہت سی کتابیں پڑھی ہیں وہ بہت اچھا لکھتی تھیں ایک آمنہ نازلی ہوا کرتی تھیں وہ بھی خاتون بڑا اچھا لکھتی تھیں۔ رہا ذکر تانیثیت کا تو یہ کیوں ہونا چاہیے۔ اگر ایک عورت لکھ رہی ہے تو وہ کیا تانیثی ادب ہو گیا۔ یہ دیکھا جائے کہ کیا لکھا یہ نہیں دیکھنا چاہیے کس نے لکھا ہے۔ اگر کوئی دیکھتا ہے تو وہ بیوقوف آدمی ہے۔ اور آج کل تو بنات کے توسل سے اتنی خواتین قلم کاروں سے متعارف ہو گئی ہوں کہ جی خوش ہو گیا میرا۔ میں واقعی بنات والوں کی مشکور ہوں۔

□□□

Dr. Nisha Zaidi
B-63/S-2,D.L.F. Colony, Sahibabad
Distt.Ghaziabad-201005 (U.P)

فرہنگ آصفیہ

لقب ۔ ع۔ اسم مذکر:۔ وہ نام جس میں معصوم کی مدح یا ذم ہو۔ وہ نام جو مدح اور ذم پر دلالت کرے۔ وہ وصفی نام جو کسی صفت خاص یا عزت وغیرہ کے سبب پڑ گیا ہو جیسے کلیم اللہ۔ موسیٰ علیہ السلام کا لقب خدا تعالیٰ کے ساتھ ہمکلام ہونے کے باعث پڑ گیا ؎

یہ اُس کے ہے ساعدوں کا عالم کہ جس نے دیکھے ہوا وہ بیدم
نیامِ تیغ قضائے مُبرم لقب ہے قاتل کی آستیں کا (ناسخ)

لق و دق ۔ ع۔ صفت:۔ وہ سخت و ہموار زمین جس میں نہ تو درخت ہوں اور نہ گھانس پات۔ یہ لفظ اصل میں لغو دغ تھا۔ چٹیل میدان۔ صحرا۔ بیابان۔ ہُو کا مقام۔ وہ میدان جہاں دُور تک یکساں زمین چلی گئی ہو اور آدمی ہو نہ آدم زاد بلکہ درخت تک بھی نہ ہوں۔ ویران زمین۔ ویرانہ۔ خرابہ۔ اُجاڑ بیابان۔ سُنسان صحرا ؎

صحرائے لق و دق میں سلگتا ہوں آپ ہی
وہ آگ ہوں گیا ہو جسے کاروان چھوڑ (انشا)

ہے مخوف یہ راہِ وادیِ عشق
جرس و کاروان کچھ بھی نہیں
لق و دق ایک مکان ہے ہُو کا
نقش پا تک نشان کچھ بھی نہیں (قطعہ معروف)

ڈاکٹر جی۔ایم۔پٹیل

امرتا پریتم

''میں نے خاموشی کے پیڑ سے یہ حرف نہیں توڑے''

امرتا پریتم پنجابی ادب کا روشن ستارہ تھیں، ایک وسیع، گہرا سمندر تھیں جو اپنی ذاتی زندگی میں پیاسی ہی رہیں، ماں کی ممتا کی پیاسی، شوہر کے پیار کی پیاسی، ساحر کی محبت کی پیاسی۔امرتا پریتم اعلیٰ سوچ، بلند خیال، خاموش مزاج، سنجیدہ لیکن ضدی، بے باک پنجابی خاتون، ہندی اور پنجابی زبان کی عظیم مصنفہ اور شاعرہ کے طور پر شہرت رکھتی ہیں۔وہ ہمیشہ بہ آواز بلند کہتی رہیں ' اے مخلوق تو اپنی انتہا پسندی وقدامت پسندی کے وہم وگمان میں اپنی روح اور دل میں اُبلتے رستے آبلوں میں اپنے پنپتے احساس اور درد کو محسوس کر اور انسانیت سے اپنی رغبت بڑھالے،فرقہ پرستی، نسل پرستی یہ تمام تکبّر وتنزل کی نشانیاں ہیں'۔

امرتا پریتم نے 31، اگست، 1919 میں گجرانوالا میں آنکھیں کھولیں۔ان کی ماں راج بیوی کے شوہر انگریزوں کی فوج میں لڑتے ہوئے فوت ہوگئے۔اپنا غم دور کرنے کے لیے قریب کے اسکول میں بچوں کو پڑھانا شروع کیا وہیں قریب ڈیرے پر متھا ٹیکنے چلی جاتیں۔ایک دن سنیاسی نوجوان نند کمار سوامی کی نظریں راج بیوی پر پڑیں تو اس کی تپسیا بھنگ ہوگئی اور اس نے سنیاس چھوڑ کر راج بیوی کے ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھائیں اور شادی کرلی اس کے بعد سنیاسی نند کمار سوامی 'کرتار سنگھ پیوش' بن گیا۔ پیوش اس کا تخلص تھا جس کے معنی 'امرت'۔دس سال بعد یعنی 31، اگست، 1919 کو ایک لڑکی نے جنم لیا جس کا نام 'امرتا' رکھا گیا۔امرتا جب بارہ سال کی ہوئیں تو ان کی ماں راج بیوی چل بسیں۔ امرتا کی پرورش اب ان کی نانی کے ذمّہ تھی۔امرتا کے انقلابی مزاج کی ایک جھلک بچپن کے اس واقعہ سے ملتی ہے کہ ایک دِن انھوں نے دیکھا کہ نانی کچھ برتن الگ تھلگ، چھوٹی ذات کے لوگوں کے لیے رکھتیں ہیں اس بات کی شکایت اپنے والد سے کی تو وہ برتن الگ رکھنے کا سلسلہ رُک گیا۔

امرتا کی زندگی کا سولہواں سال ہر طرح سے خاص رہا۔اسی سال ان کا پہلا مجموعہ کلام 'امرت لہر' بازار میں آیا اور اسی سال سردار پریتم سنگھ سے ان کا بیاہ ہوا۔یہ رشتہ ماں باپ نے بچپن ہی میں طے کردیا تھا۔اب امرتا ''امرتا پریتم'' بن گئیں۔1960 کے آتے آتے پریتم سنگھ اور امرتا کے خیالات میں دوری اس قدر بڑھ گئی کہ شادی کا بندھن ٹوٹ گیا۔مگر امرتا کے ساتھ 'پریتم' جُوا رہا۔ملک کی تقسیم کے بعد فرقہ وارانہ فساد پھوٹ پڑے، انسانیت کے قتلِ عام کا وہ منظر حشر کا میدان بن گیا جسے دیکھ کر زمین کانپ اُٹھی آسمان رو پڑا، انسانیت اس حیوانیت سے شرمسار تھی۔امرتا نے ولی وارث شاہ کے دربار میں حاضری دی، گڑگڑایا فریاد کی:

وارث شاہ، اے آقا جاگ جاؤ اور دیکھو اپنی نظروں سے قیامت کا یہ منظر یاد ہے نا آپ کو میرے آقا، جب پنجاب کی ایک بیٹی پہ ظلم ہوا تھا وہ روئی تھی

اس وقت آپ نے ماتم منایا، قصیدے لکھے، دوہے لکھے

اے دردمندوں کے ہمدرد، میرے آقائے بزرگ۔۔۔

آج دیکھو۔۔۔ دیکھو، یہاں لاکھوں بیٹیاں رو رہی ہیں ماتم منا رہی ہیں

جدھر نظریں دوڑاؤ لاشیں ہی لاشیں، ماؤں کی، معصوم بچوں کی، مردوں کی لاشیں، عورتوں کی لاشیں

ہر طرف لاشیں ہی لاشیں، ہر طرف لہو ہی لہو

اور لہو سے بھری چناب۔۔۔۔

کچھ عرصہ بعد تقسیم کے موضوع پر امرتا کا ناول 'پنجر' منظر عام پر آیا جس پر ہندوستان میں فلم بنی اور کافی مقبول ہوئی۔

امرتا اس صدمہ سے پوری طرح ٹوٹ گئیں اور ہندوستان کے شہر دہرادون میں بس گئیں بعد میں انھوں نے دلی میں بسنے کا فیصلہ کرلیا۔ آکاش وانی کے ساتھ ایک براڈ کاسٹر کی حیثیت سے کام کرتی رہیں۔

امرتا پریتم اور ساحر لدھیانوی

امرتا اور ساحر دونوں نے لاہور کے ایک ہی اسکول میں تعلیم حاصل کی۔ ساحر سے نزدیکیاں بڑھیں تو دونوں خاصے بے تکلف ہوگئے۔ ملاقاتوں کے سلسلے بڑھتے چلے گئے، دونوں کی داستانِ عشق جب اسکول کی دیواریں پھلانگنے لگیں تو اس کی خبر کرتار سنگھ کو ہوئی انھوں نے سخت الفاظ میں پرنسپل سے شکایت کی، پرنسپل نے فوراً ساحر کو اسکول سے نکال دیا۔ جب ضدی مزاج امرتا کو اس کی خبر ملی تو انھوں نے نہ صرف طے کرلیا بلکہ قسم کھالی کہ وہ اپنی زندگی میں ساحر کو پا کر ہی دم لیں گی۔

جب امرتا کو پتہ چلا کہ ساحر لدھیانوی آزادی کے بعد ہندوستان پہنچ گئے ہیں تو امرتا بھی اس کی تلاش میں ہندوستان آئیں اور دہرادون میں مقیم ہوئیں۔ اکثر آس پاس کے گاؤں میں مشاعرے ہوتے تو امرتا ہمیشہ ان میں شامل ہوتیں۔ اتفاقاً ایک گاؤں کے عالمی مشاعرے میں جب امرتا کو پتہ چلا کہ ساحر بھی اس میں مدعو ہے تو بس وہ حواس باختہ ہوگئیں۔ موسم کی پرواہ کیے بغیر اس گاؤں میں پہنچ گئیں اور مشاعرے میں جب ساحر کو اپنے روبرو دیکھا تو بس دیکھتی ہی رہ گئیں۔ مشاعرے کے بعد امرتا اور ساحر دونوں نے 'لوپوکی' گاؤں پہنچ کر وہاں سے لاہور کے لیے بس پکڑی۔ 5 کلومیٹر کی دوری تک دونوں ایک ساتھ چلتے رہے۔ امرتا نے ساحر کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔ طوفانی بارش، کیچڑ سے بھرے راستے، نکیلی پتھروں کی تکلیف ان سب کا احساس ہی نہ رہا۔ امرتا نے محسوس کیا کہ یہ ضرور کسی پچھلے جنم کا ساتھ ہے۔ تقدیر نے اس رات ان کی قسمت اور دل میں عشق کا بیج بو دیا جو جلد ہی پھلنے پھولنے لگا۔ دونوں میں ملاقاتیں بڑھنے لگیں ان میں سے چند اہم ملاقاتیں جن کا ذکر امرتا اس طرح کرتی ہیں۔

'جب بھی ساحر، مجھ سے ملنے گھر آتا تو، جیسے میری ہی خاموشی سے نکلا خاموشی کا ایک ٹکڑا میرے ہی سامنے کرسی پر بیٹھ کر چپ چاپ سگریٹ کے کش پہ کش لگاتا، آدھی سگریٹ کو بجھا کر راکھ دانی میں رکھ دیتا اور کچھ مرغولے کمرے میں ادھر بکھر بھی جاتے۔ میں چاہتی تھی اس کے ہاتھ کو چھولوں پر نہیں خاندانی تہذیب، روایتوں کی پاسداری کے سبب ہاتھ اپنی جگہ ساکت ہوجاتے۔ ہاں اس کے جانے کے بعد ان بکھرے سگریٹ کے ٹکڑوں کو سمیٹ کر الماری میں رکھ دیتی اور جب میں تنہا ہوتی اور عشق کی آگ سینے میں سلگتی تو سگریٹ کے ان ٹکڑوں کو الماری سے نکال کر اپنی انگلیوں سے چھولیتی تو بس ساحر کا لمس میرے تن بدن میں سرایت کر جاتا۔ اس سگریٹ کے ٹکڑے کو سلگاتی اور دھوئیں کے مرغولے سارے ماحول کو خوابیدہ بنا دیتے اور میں ساحر کے خیالات میں ڈوب جاتی۔ مجھے ایک عجیب مسرت کا احساس ہوتا جس کا بیان کرنا مشکل ہے۔ یہیں سے میں سگریٹ نوشی کی عادی ہوگئی۔

'تاج محل' ساحر کی اس مشہور نظم کو خود ساحر نے ایک خوبصورت فریم میں چسپاں کر کے امرتا کے لیے ایک تحفہ کے طور پر دے دیا اور امرتا نے ساری عمر اسے اپنے کلیجے سے لگائے رکھا:

ان گنت لوگوں نے دُنیا میں محبت کی ہے

کون کہتا ہے کہ صادق نہ تھے جذبے ان کے

لیکن ان کے لئے تشہیر کا سامان نہیں

کیونکہ وہ لوگ بھی میری ہی طرح مفلس تھے

یہ چمن زار، یہ جمنا کا کنارہ یہ محل

یہ منقش دیوار، یہ محراب یہ طاق

ایک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر

ہم غریبوں کی محبت کا اُڑایا ہے مذاق

میرے محبوب کہیں اور ملا کر مجھ سے

ساحر کی طویل نظم 'تلخیاں' کی تمام تر نظمیں جیسے ساحر نے صرف اور صرف امرتا کے لیے لکھی تھیں اور امرتا نے بھی پنجابی طویل نظم 'سنہڑے' میں صرف ساحر کی محبت لکھی۔ فون پر امرتا کو جب خبر ملی کہ 'سنہڑے' کو نیشنل ایوارڈ مل گیا تو وہ سر سے پاؤں تک کانپ اُٹھیں اور پھر اوپر والے سے شکوہ کیا۔ 'اے خُدایا یہ نظم میں نے کوئی ایوارڈ یا انعام پانے کی خاطر تو نہیں لکھی۔ جس کے لیے لکھی اس نے ہی نہیں پڑھا ساری دُنیا بھی انھیں پڑھ لے تو کیا حاصل!' 'سنہڑے' کے ایوارڈ کے اعلان کے بعد سارے

اخباروں کے نمائندوں کا امرتا کے گھر پر ہجوم ہوگیا۔ وہ چاہتے تھے کہ امرتا اس نظم کو کاغذ پر لکھتی رہیں اور امرتا کی اسی پوز میں ان کی تصویر لی جائے۔ امرتا نے لکھنا شروع کیا اور دیر تک ایک دھن میں، ایک سوچ میں ڈوبی لکھتیں رہیں، فوٹوگرافر نے تصویریں کھینچ لیں اور وہ چلے گئے۔ امرتا نے جب اپنے تحریر کردہ کاغذ کو دیکھا تو پریشان ہوگئیں، کیونکہ انھوں نے سارے کاغذ کو ساحر، ساحر، اور ساحر سے بھر دیا تھا اور کل اخبار میں اس کی فوٹو کے ساتھ یہ ساحر ساحر لکھا کاغذ بھی چھپ جائے تو؟ لیکن ایسا ہوا نہیں جس پوز میں تصویر چھپ گئیں وہ صرف امرتا کی انگلیوں تک ہی محدود تھیں۔

امرتا پریتم اور امروز (اندر جیت)

امرتا کی زندگی کا ایک اور رُخ تھا امروز۔ امرتا اور امروز ایک دوسرے سے انجان بالکل بھی نہیں تھے۔ لاہور میں امروز (اندر جیت) جب ساتویں جماعت میں تھے تب امرتا کو دیکھا بس ان کے بے مثال حُسن کو دیکھتے ہی رہے۔ امرتا کا ناول 'ڈاکٹر دیو' جب کتابت اور اس کے سر ورق کے ڈیزائن کے لیے امروز کے پاس پہنچا تو اس نے محسوس کیا کہ اس نے سنہرے موقع کو پالیا۔ اس ناول کا مطالعہ بالاستعیاب اور غور وفکر سے کیا اور اس ناول کے ہیرو "ڈاکٹر دیو" کو اپنے اندر سمو لیا اور امرتا سے فون پہ رابطہ میں رہا۔ اس کے بعد دونوں اپنی اپنی قابلیت اور ذہانت کی بنا پر ایک دوسرے کے قریب ہوتے گئے۔

جیسا کہ واضح ہو چکا ہے کہ ہندوستان کی آزادی کے بعد لاہور سے ساحر ہندوستان پہنچے، پہلے دلّی اور بعد میں بمبئی میں بس گئے اور پھر ساحر کی تلاش میں امرتا پہنچیں وہ پہلے دہرادون پھر دلّی میں مقیم ہوگئیں۔ ان کے بعد امروز امرتا کی تلاش میں دلّی پہنچ گیا اور اُسی محلے میں بس گیا جس محلے میں امرتا رہتی تھیں۔

8 جنوری 1964 میں امرتا نے امروز سے ایک ساتھ رہنے کی قسمیں کھائیں اور نئی زندگی کا آغاز کیا۔ دونوں کا یہ مثالی غیر روایتی تعلق قریب 45 سال تک کامیابی کے ساتھ جاری رہا۔

اس دوران ایک صبح ایسی بھی خبر آئی جو تمام اخباروں کی سُرخی تھی۔ 'دل کا دورہ پڑنے سے ساحر لدھیانوی کا انتقال ہوگیا'۔

امرتا اس گہرے صدمہ کی تاب نہ لا سکی ان پر سکتہ سا طاری ہوا اور پھر اسی صدمے اور غم کی حالت میں امرتا نے بیان کیا آج مجھے یاد آتا ہے 1962 کا وہ واقعہ جب دلّی میں ایشین رائیٹرس کانفرنس میں، میں اور ساحر دونوں شریک تھے۔ ساحر نے شرارتاً اپنے ناموں کے وہ بیج بدل دیے۔ میرا بیج ساحر کے پاس تھا اور ساحر کا میرے پاس۔ بس یہی ادلا بدلی کا نتیجہ کہ موت اسے میرے نام کے بیج کو پڑھ کر ساحر کو اُٹھا لے گئی اور میں رہ گئی یہاں تنہا'۔

یہ تنہائی 31، اکتوبر 2005 کو ختم ہوگئی طویل علالت کے بعد امرتا نے امروز کی باہوں میں دم توڑ دیا۔

امرتا جاتے جاتے امروز کے دل و دماغ میں کچھ یوں بس گئیں

میں تمھیں پھر ملوں گی کہاں کیسے پتہ نہیں
شاید تیرے خیالوں کی تحریک بن کر تیرے کینوس پر اتروں گی
یا تیرے کینوس پر ایک مشتبہ لکیر بنی خاموش تجھے دیکھتی رہوں گی
یا سورج کی لَو بن کر تیرے رنگوں کُھلتی رہوں گی
یا رنگوں کی باہوں میں بیٹھ کر تیرے کینوس پر بچھ جاؤں گی
میں اور تو کچھ نہیں جانتی پر اتنا ضرور جانتی ہوں
وقت جو بھی کریگا میرے جنم کے ساتھ چلے گا
پر یہ جسم فنا ہے سب کچھ فنا ہو جائے گا
پر یادوں کے دھاگے کائنات کے لمحوں کی طرح ہوتے ہیں
میں ان لمحوں کو چنوں گی ان دھاگوں کو سمیٹ لوں گی
میں تمھیں پھر ملوں گی کہاں کیسے پتہ نہیں

امرتا کی ان گنت نظموں کو اس مضمون میں شامل کرنا ممکن نہیں ہے۔ ان میں سے ایک۔۔

میں نے خاموشی کے پیڑ سے یہ حرف نہیں توڑے
یہ تو جو پیڑ سے جھڑتے تھے میں وہی چُنتی رہی۔۔
نہیں، آپ سے یا کسی اور سے میں کچھ نہیں کہتی
یہ تو جو خون میں بولے میں وہی لفظ سُنتی رہی۔۔
ایک طویل برق لکیر تھی جو سینے سے گذری تھی
یہ کچھ وہی برق پارے ہیں میں انگلیوں پر گنتی رہی۔۔

چاند نے چرخے پر بیٹھ کر بادلوں کی روئی کاتی
یہ کچھ وہی دھاگے ہیں میں کھڈی پر بُنتی رہی
میں نے خاموشی کے پیڑ سے یہ حرف نہیں توڑے

□□□

Dr. G.M. Patel
B-5/ 402 , Bramha Majestic
N.I.B.M. Road
Pune-411 048 (M.S)

شاعرات کے منتخب اشعار

طوفان سے لے ٹکر، گر خواہشِ منزل ہے
وہ سامنے ساحل ہے، موجوں سے گزر پہلے

اس دل وحشی کے ہاتھوں در بدر پھرتے رہے
ہم سراپا عشق بن کر ٹھوکریں کھاتے رہے

صالحہ بیگم مخفی

ہے دل کشتی میں وہی اب بھی موسموں کی بہار
نظر میں کیفیت رنگ و بو نہیں باقی

ہیں ساتھ آج بھی شورشیں مگر دل میں
سکت نہیں ہے جسارت کی خو نہیں باقی

حیا لکھنوی

درد ہی ہے وہ چیز کہ جس کو
بھولنا چاہوں بھول نہ پاؤں

کون ہے اے ناشاد مسیحا
کس کو دل کے زخم دکھاؤں

رابعہ سلطانہ ناشاد

ہنس پڑی آہیں مدینے سے وہ سوغات ملی
معجزہ کیا ہے یہاں آکے ہی سمجھا میں نے

ایسا ہو جائے کہ میں خاک مدینہ ہو جاؤں
اور میرے لیے اس قرب سے اچھا کیا ہے

رضیہ حلیم جنگ

کہاں کے عشق و محبت کدھر کے ہجر و وصال
ابھی تو لوگ ترستے ہیں زندگی کے لیے

اک وسعت خیال کہ لفظوں میں گھر گئی
لہجہ کبھی جو ہم کو کرم آشنا ملا

زہرا نگاہ

کسی کی آوارگئ شوق یہاں بھٹکے گی
دشت تنہائی میں گونجی تھی صدا میرے بعد

مدت سے دل و جان و نظر سب ہیں بیاباں
ہم جس کو مکاں کہتے ہیں وہ ایک کھنڈر کیا

ساجدہ زیدی

ازل طلسم انھیں کا ابد انھیں کا فسوں
کہاں حیات ہمیں لائی آگہی کے لیے

رہا نہ اک تبسم بھی گلستاں کے لیے
چمن کی ساری بہاریں ہیں باغباں کے لیے

وحیدہ نسیم

وہ اک نگاہ کہ ہے چارہ گر بھی قاتل بھی
نہ جانے کتنوں کو جینا سکھا گئی ہوگی

ہے کس کے دردِ فروزاں سے شمع دل روشن
ہے کس کی یاد سے مہکی ہوئی حیات تمام

ممتاز مرزا

صالحہ عابد حسین

قدسیہ زیدی

پ: 23 دسمبر 1914 و: 27 دسمبر 1960

کلامِ الٰہی پروردگارِ عالم نے فرمایا ہے "ہم نے صورتیں بنائیں اور کیا اچھی صورتیں بنائیں" حقیقت یہ ہے کہ فیاضِ ازل نے جتنی چیزیں خلق کیں ان میں تناسب موزونیت، حسن اور دلکشی کا عجیب امتزاج ہوتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ہم اپنی کم نگاہی کے باعث اسے دیکھ سکیں، یا نہ دیکھ سکیں۔ لیکن اس جلوہ گاہِ ناز میں ہر چیز میں اس کے حُسن کا پرتو موجود ہے۔

میری جانبار دوست قدسیہ زیدی ان چند بے مثال ہستیوں میں سے ایک تھیں جن کو قدرت اپنی بے پناہ فیضایوں سے سرفراز کرتی ہے اور جس کی سیرت وصورت دونوں کا حسن و جمال دلوں کو تسخیر اور آنکھوں کو خیرہ کرتا ہے۔

قدسیہ کے مداحوں اور قدر دانوں و چاہنے والوں کی بہت بڑی تعداد ہے لیکن یہ انوکھی بات نہیں۔ لیکن ان کے قریبی دوستوں کا حلقہ بھی بہت وسیع ہے، جو کسی کسی خوش نصیب کے حصے میں آتا ہے۔ آج ان کے کتنے چاہنے والے یہ محسوس کر رہے ہیں کہ ایک انمول شے ان سے چھن گئی۔

قدسیہ نسلاً کشمیری تھیں اور ان کے تیکھے نقش، ذہین آنکھیں، شفاف موتی کا سا رنگ، کتابی چہرہ اور سیاہ بال، سبھی کشمیری حسن کے غماز تھے لیکن ان کا صاف شستہ لہجہ سن کر کوئی اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ ان کا اصل وطن کشمیر اور وطنِ ثانی پنجاب ہے جہاں ان کے دادا آ کر بس گئے تھے۔ قدسیہ کی پیدائش دلّی کی تھی بچپن یہیں بیتا۔ اعلیٰ تعلیم پنجاب میں پائی۔ شادی کے بعد ایک عرصے تک رامپور میں رہیں اور پھر دلی آن بسایا اور علی گڑھ بھی آتی جاتی رہیں۔ ان کی غیر معمولی شخصیت میں ان سب مقامات کی تہذیب و کلچر کا بڑا خوبصورت امتزاج دیکھا جا سکتا تھا۔

وہ اپنے بھائی بہنوں میں سب سے چھوٹی تھیں اور اسی لیے باپ کی بہت چہیتی تھیں، ماں کی آغوشِ محبت سے کم سنی میں محروم ہو گئی تھیں۔

لیکن باپ کی محبت اور توجہ اور بڑی بہنوں کی اُلفت اور بہنوئی (پطرس) کی شفقت نے انھیں اپنی محرومی اور دکھ کو سہارنے کی قوت بخشی۔ خاندان کی یہ سب سے ذہین بچی سب کی لاڈلی تھی۔ اس لیے باپ نے اعلیٰ تعلیم دلانے کا فیصلہ کیا۔ قدسیہ کو کتابی اور اسکولی تعلیم سے زیادہ دلچسپی نہ تھی۔ وہ قہقہے لگا لگا کر سنایا کرتیں کہ ہم نے کبھی امتحان تھرڈ کلاس سے زیادہ نمبروں میں پاس ہی کر کے نہ دیا۔

قدسیہ کا دل کتنا دردمند اور حساس تھا، بچپن ہی سے انھیں کتنے صدمے سہارنے پڑے، اسے کم ہی لوگ جانتے تھے۔ ان کے کھنکتے قہقہے، باغ و بہار طبیعت، دلچسپ گفتگو اور پھڑکتے فقرے سن کر کون اندازہ لگا سکتا تھا کہ اس دل میں کتنے داغ ہیں؟ وہ غم کو ایسی دولت سمجھتی تھیں، جس میں کسی کو شریک نہیں کیا جاتا۔

شورشِ باطن کے ہیں احباب منکر ورنہ یاں
دل محیطِ گریہ ولب آشنائے خندہ ہے

بچپن میں ماں کی جدائی، نوعمری میں باپ کی مفارقت، پھر اکلوتے جوان بھائی کا داغ، شادی کے بعد اپنے پہلے بچے کا غم انھوں نے بڑے حوصلے سے یہ سب صدمے سہارے، مگر دل اتنا حساس اور دردمند تھا کہ ہر کسی کے دکھ اور غم میں تڑپ اٹھتا اور وہ غمزدہ کے لیے سب کچھ کرنے کو تیار ہو جاتیں۔ قدسیہ کی شخصیت کو نکھارنے میں دردِ دل کی اس دولت کا بڑا حصہ ہے۔

والد کے انتقال کے بعد قدسیہ اپنی بڑی بہن بیگم بخاری کے سایۂ عاطفت میں آ گئیں۔ بہن سوتیلی تھیں اور احمد شاہ بخاری پطرس پھوپی زاد بھائی، مگر دونوں ان کو سگی بہن کی طرح چاہتے تھے۔ پطرس کی غیر معمولی ذہانت اور ظرافت سے کون ادبی ذوق رکھنے والا واقف نہیں؟ ان کی صحبت میں قدسیہ کی ظرافت اور ذہانت کو اور جلا ملی اور شعر و ادب کا ذوق بھی پیدا

ہوا۔ رسمی تعلیم صرف بی، اے تک تھی جس میں نمایاں کامیابی حاصل نہیں کی تھی۔ لیکن ان کی قابلیت اس سے بہت زیادہ تھی۔ ان کی سوجھ بوجھ، مطالعہ، معلومات غیر معمولی تھیں۔ انگریزی بڑی روانی سے اور بے تکان بولتی تھیں۔ سیاست پر گہری نظر تھی اور بڑے سے بڑے سیاست کے کھلاڑیوں کو وہ بحث میں ہرا کر قہقہے لگا سکتی تھیں۔ شعر و ادب پر گفتگو کرتیں تو ادیب و نقاد ان کا منہ تکتے رہ جاتے۔ آرٹ اور کلچر سے ان کو خاص ذوق تھا ہی اور اس میدان میں ان کا لوہا سبھی نے مانا اور اس کے لیے خاص کر ڈراما اور اسٹیج کے احیا کے لیے انھوں نے اتنا کچھ کیا جس کا احاطہ آسان نہیں۔

1937 میں ان کی شادی سید بشیر حسین زیدی سے ہوئی جو اس وقت رامپور کے چیف منسٹر تھے۔ ریاست رامپور خاصی بڑی ریاست تھی اور اس کا چیف منسٹر ہی اس کا کرتا دھرتا ہوتا تھا۔ چیف منسٹر کے ساتھ اس کی بیوی پر بھی بہت سی ذمے داریاں عائد ہوتی تھیں بہت سے کاموں میں ہاتھ بٹانا پڑتا تھا۔ سرکاری تقریبوں میں شرکت کرنا، انگریز، ولی نعمت' افسروں سے نپٹنا، 'سرکار' یعنی والی ریاست کی مرضی اور حکم کا خیال رکھنا، بڑی بڑی دعوتوں میں میزبانی کے فرائض انجام دینا، والی ریاست کے پورے خاندان سے عزیزانہ و نیازمندانہ تعلقات رکھنا اور خدا جانے اور کیا کیا۔ قدسیہ کی طبیعت آزاد تھی اور صاف گوئی اور خودداری ان کے مزاج کا جزو۔ مگر شوہر کی خاطر ان کو ریاستی آداب کو نباہنا پڑتا تھا۔ اگرچہ وہ اس سے خاصی الجھتی تھیں۔ ساتھ ہی اپنے شوہر کے وسیع خاندان کی ذمہ داریاں بھی اٹھانی ہوتی تھیں اور بیس بائیس برس کی اس ناتجربہ کار لڑکی نے چند مہینوں میں بڑی خوبی سے ان خوشگوار اور ناخوشگوار فرائض کو سمجھ کر ان کا بار اپنے کندھوں پر اٹھا لیا۔ اس سے بھی عجیب بات یہ ہے کہ اس ناسازگار ماحول میں انھیں بچوں کے ادب سے دلچسپی پیدا ہوئی اور نہ صرف اس کے لیے وقت نکالا، بلکہ دل و جان سے اس میں لگ گئیں۔ انگریزی زبان کی سینکڑوں بچوں کی کتابوں کو پڑھا، تصویروں کا مطالعہ کیا اور یہ دُھن لگ گئی کہ اردو میں بچوں کے لیے بہترین چھپائی لکھائی اور تصویروں کے ساتھ کہانیوں کی دلچسپ کتابیں شائع کی جائیں۔

انھوں نے بچوں کا ادب کھنگالا اور اس میں جو موتی نظر پڑا اسے چن لیا۔ جو کہانی پسند آئی اسے وہ ہندوستانی روپ میں ڈھال کر، سلیس، رواں، آسان زبان میں بچوں کے لیے اردو کی ایک پیاری سی کتاب مرتب کر دیتیں۔ آرٹسٹوں سے تصویریں بنوانے میں سینکڑوں روپیہ صرف کر دیتیں، اپنے پاس سے چھپواتیں۔ شاید 1948 یا 1949 کا ذکر ہے جب میں ان کے ہاں رامپور گئی ہوئی تھی۔ اس وقت وہ اپنی بچوں کی پہلی کتاب الجیلی بچھیا مرتب کر رہی تھیں۔ کیا انہماک تھا، کیا شوق تھا۔ ہر وقت اسی کا ذکر، اسی کی فکر، تصویریں دیکھی جا رہی ہیں، بحث ہو رہی ہے، تخمینہ بن رہا ہے، طباعت و اشاعت کے منصوبے بنائے جا رہے ہیں، جیسے اس سے بڑھ کر اہم کام دنیا میں ہے ہی نہیں۔ ان کے شوہر زیدی صاحب اور دوست ذاکر صاحب کو بھی بچوں کے لیے عمدہ کتابیں چھپوانے کا شوق تھا اور ان لوگوں نے ان کے شوق کو اور مہمیز دی۔ اس وقت تک ہمارے ہاں یہ سمجھا جاتا تھا کہ بچوں کے لیے کتابیں لکھنا بڑا آسان کام ہے، مگر قدسیہ زیدی جانتی تھیں کہ بچوں کے لیے لکھنا بڑوں کے لیے لکھنے سے بھی زیادہ دشوار کام ہے۔ پھر ان کا اصول تھا کہ جو کام کیا جائے اچھی طرح کیا جائے۔ گاندھی بابا کی کہانی لکھنے میں جتنی محنت اور جان کاہی قدسیہ نے کی اکثر لوگ بڑے بڑے علمی اور تحقیقی مقالے لکھنے میں اس سے آدھی زحمت بھی گوارا نہیں کرتے۔ کئی کئی بار ایک ایک باب کو لکھتیں، زبان اور ادب کے ماہرین کو دکھاتیں، گاندھی جی سے جو لوگ بہت قریب تھے ان سے مشورہ لیتیں۔ بار بار ترمیم و تنسیخ کرتیں۔ کسی سے مشورہ یا مدد دینے میں انھیں ذرا بھی جھجک نہ ہوتی تھی۔ معمولی لوگوں سے لے کر بڑے عالموں، ادیبوں، نقادوں ہر ایک سے بے تکلفی کے ساتھ بغیر کسی احساس کمتری یا برتری کے وہ مشورہ اور مدد لیتی تھیں اور معقول ہوتا تھا تو مانتی تھیں۔ انھوں نے بچوں کے لیے کئی کتابیں لکھیں۔ دوسری زبانوں سے اڈیٹ بھی کیں اور خود بھی لکھیں اور کم و بیش ہر ایک میں اسی طرح محنت کی۔ کچھ شائع ہو چکی ہیں کچھ ابھی زیور طباعت سے محروم ہیں۔ اگر قدسیہ نے صرف اسی صنف ادب کو اپنایا ہوتا تو وہ اس میدان میں اپنا لوہا منوا لیتیں۔ گاندھی بابا کی کہانی بچوں کے لیے گاندھی جی پر لکھی تمام کتابوں سے بہتر مانی گئی ہے۔ پنڈت نہرو نے اس کا دیباچہ لکھ کر اور وزارت تعلیم نے اس موضوع پر لکھی بہترین کتاب مان کر اسے انعام دے کر اعتراف بھی کیا ہے۔ مگر قدسیہ کا مزاج بڑا من چلا تھا اور نئے نئے میدان خدمت کے تلاش کرنے میں انھیں لطف آتا تھا۔ ہمیشہ خوب سے خوب تر کی تلاش کرنے میں رہتی تھیں۔ جو کام سب سے مشکل اور بظاہر ناممکن سا نظر آئے قدسیہ اس کا بیڑا بڑھ کر اٹھا لیتی تھیں اور تن من سے اس میں لگ جاتی تھیں۔

شنکر کے بچوں کے آرٹ کے مقابلے، تصویروں اور گڑیوں کی نمائشوں سے انھیں بڑی دلچسپی تھی۔ اگر یہ کہوں کہ شنکر ان مقابلوں اور نمائشوں کی روح رواں شنکر ہی کی طرح قدسیہ بھی تھیں تو یہ مبالغہ نہ ہوگا۔ وہ انتہائی ذوق و شوق اور محنت سے سارے کام و انتظام کرتیں اور پھر اس کمال سے پس پردہ رہتیں کہ قریب کے لوگوں کے سوا کسی کو پتہ نہ چلتا کہ ان میں

قدسیہ کا کتنا ہاتھ ہے۔ یہی کیا جامعہ ملیہ میں خاص کر اس کی پچیس سالہ جوبلی میں اور بعد میں علی گڑھ یونیورسٹی کے کاموں میں، انھوں نے کتنا حصہ لیا، کس قدر خدمات انجام دیں، کٹھن وقتوں میں کیسے کیسے سہارے دیے یہ چند ہی لوگ جانتے ہیں۔

لیکن جس کام کے پیچھے انھوں نے اپنے کو مٹا دیا تھا وہ تھا ہندوستانی تھیٹر۔ شمالی ہند میں پھر سے اچھا ڈراما اور تھیٹر کا ذوق پیدا کرنا۔ دوسری زبانوں کے بہترین کلاسیکی ڈراموں کو عوامی رنگ میں ڈھال کر لوگوں کے سامنے پیش کرنا اور ان کے بگڑے مذاق کو (جس کو گھٹیا فلموں نے اور بگاڑ دیا تھا) سنوارنا ان کا مقصد تھا جس کی خاطر نہ وہ دن کو دن سمجھتی تھیں نہ رات کو رات، سات آٹھ سال پہلے انھیں پہلے ڈرامے لکھنے اور اڈیٹ کرنے سے، اور پھر اسٹیج سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ لفظ دلچسپی اس ذوق وشوق، اس انہماک، اس محنت کے لیے جو قدسیہ نے کی بہت ہلکا لفظ ہے۔ ان کے ہاں دلچسپی کے معنی ہوتے تھے تن، من، دھن سے اس میں جان توڑ محنت کرنا۔

قدسیہ کا انگریزی ادب کا مطالعہ اچھا خاصا تھا اور جب سے ڈراما سے دلچسپی پیدا ہوئی تو پھر انھوں نے شاید ہی انگریزی کا کوئی ڈراما چھوڑا ہو، جسے پڑھا نہ ہو۔ ساتھ ہی اردو زبان کے سب ڈرامے، پرانے اور نئے پڑھ ڈالے۔ ہندی اور سنسکرت وغیرہ کے پڑھ نہیں سکتی تھیں تو سنتی تھیں اور ان میں سے جو بھی ڈراما پسند آجاتا اس کو اردو یا ہندستانی، کا جامہ پہنانے کی دھن میں لگ جاتی تھیں۔ بار بار پڑھتیں یا سنتیں۔ گیت لکھواتیں، ادیبوں سے زبان پرکھواتیں، نقادوں سے مشورے لیتیں۔

جس لگن اور محنت سے وہ یہ کام کرتی تھیں کوئی غریب ادیب زندہ رہنے کے لیے کم کرتا ہوگا۔ لطف یہ کہ اس کے ساتھ ساتھ سارے سوشل اور خاندانی اور سماجی فرائض بھی انجام پاتے رہتے۔ لوگ ملنے آ جا رہے ہیں۔ ان کی خاطر تواضع ہو رہی ہے، پان کھائے جا رہے ہیں، کافی بن رہی ہے، دنیا بھر کی باتیں، لطیفے، قصے ہو رہے ہیں، قہقہے لگ رہے ہیں، کسی کی دلداری ہو رہی ہے، کسی کو بنایا جا رہا سامنے فرشی لمبی سی میز پر بہت سی کتابیں، چند کاپیاں، قلم و دوات وغیرہ دھرے ہیں۔ اس سلسلے میں کام کرنے والے دو ایک لوگ بھی بیٹھے ہیں۔ جیسے ہی تھوڑا وقت ملا پھر کاغذ قلم سنبھال لیا دو چار سطریں لکھ یا کاٹ ڈالیں۔ جب سب چلے گئے، تو کام میں جٹ گئیں۔ پھر لوگ آ گئے۔ قلم دوات رکھ دیا گیا اور خاطر داری شروع ہو گئی۔ رات گئے تک، صبح سویرے، دوپہر اور شام کو لوگ تفریح یا آرام کرتے، ان آخری چند سالوں میں قدسیہ ایک جفاکش مزدور کی طرح تالیف و ترجمہ کے کام میں جٹی رہتی تھیں۔ انھوں نے خود ڈرامے تخلیق نہیں کیے۔ وہ اپنے کو ادیب کہتی یا سمجھتی بھی نہ تھیں۔ ہاں دوسری زبانوں کے ڈراموں کو اردو اور ہندستانی کا جامہ پہنا کر انھوں نے ڈرامے کی بڑی خدمت کی ہے۔ ممکن ہے سخت گیر نقاد ان کے کاموں کو اعلیٰ معیاری ادب میں جگہ نہ دیں، مگر یہ حقیقت ہے کہ اسٹیج کو قدسیہ وہ کچھ دے گئیں جس کو بھلایا نہیں جا سکتا۔ ان ڈراموں میں شکنتلا، گڑیا، گھر مٹی کی گاڑی، خالد کی خالہ ان کے مشہور اور مقبول ڈرامے ہیں جن کو خود ان کی زندگی میں اور ان کی زیر نگرانی بار بار اسٹیج کیا گیا اور عوام و خواص میں پسند کیا گیا اور ان کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔

اچھے ڈراموں کے لیے اچھے اسٹیج کی ضرورت ہوتی ہے اور ہندوستان خصوصاً شمالی ہند میں یہ قریب قریب ختم ہو چکا تھا۔ قدسیہ نے اس کمی کو پوا کرنے کا عزم کر لیا اور حسب عادت جرأت رندانہ سے کام لے کر 'ہندستانی تھیٹر' قائم کر ڈالا۔ اس تھیٹر کے لیے انھوں نے بہت کچھ کیا ہے جس پر ان کا کوئی ساتھی اگر چاہے، تو پوری کتاب لکھ سکتا ہے۔ اس کے لیے انھوں نے کیا کیا پاپڑ بیلے۔ چندے کیے، تھیٹر میں کام کرنے والے کہاں کہاں سے ڈھونڈھ کر لاتی تھیں، فنکاروں اور شاعروں کے کیسے کیسے نخرے اور ناز برداریاں اٹھاتی تھیں نوجوانوں سے کس محبت اور اپنائیت کا سلوک کرتی تھیں، مخالفوں کی کیسی کیسی باتیں سہارتیں! اس مقصد کی خاطر انھوں نے عیش و آرام تج دیا، کٹھن سفر کیے، آرٹسٹوں کے ساتھ دوپہر کو بازار کے چھولے بٹورے کھائے۔ دن رات ان کو سکھانے میں بسر کیے، ان کے ساتھ زمین پر سوئیں اور کیا کچھ نہیں کیا۔ کسی بھی دوسرے سوشل کام میں وہ اس سے بہت کم محنت سے بہت زیادہ شہرت اور ناموری پا سکتی تھیں مگر سہل کام قدسیہ کو رجھاتے نہ تھے۔ جو کام ہر کوئی کر سکے اس کے کرنے میں لطف ہی کیا؟ وہ تو اس کام کی شیدا ہوتی تھیں جس میں رکاوٹیں ہوں، مخالفتیں ہوں، کٹھنائیاں ہوں! قدسیہ کو فکر تھی کہ ہندستانی تھیٹر کو نمونے کا اسٹیج بنا کر ہندی تھیٹر کو حیاتِ نو بخشیں اور سارے ملک میں اسے مقبول بنائیں۔ ساتھ ہی اس کے لیے اتنا سرمایہ فراہم کر جائیں کہ مالی مشکلات اس کی راہ میں حائل نہ ہوں۔ مگر صد حیف کہ قدسیہ کی عمر نے وفا نہ کی۔ اتنی سخت محنت ان کا جسم سہار نہ سکا اور وہ یوں اچانک چل بسیں جیسے پھول سے خوشبو اڑ جاتی ہے۔

لیکن یہ ادبی اور تہذیبی کام قدسیہ کی زندگی کا ایک پہلو تھا، پوری زندگی نہیں۔ وہ قدرت کی طرف سے ایسا دماغ لے کر آئی تھیں جس میں گوناگوں دلچسپیاں اور صلاحیتیں پوشیدہ تھیں۔ جس شوق سے وہ قومی، ادبی، تہذیبی کاموں میں حصہ لیتی تھیں اس سے بھی زیادہ لگن اور شوق سے

چھوٹے چھوٹے گھریلو کام اور خاندانی ذمہ داریاں اٹھاتی تھیں۔ دوستوں، ہمسایوں اور نوکروں اور راہ چلتے لوگوں تک کی خوشی اور غم میں حصہ لیتی تھیں اور مدد کرتی تھیں۔ انھیں زندگی سے پیار تھا، زندگی کی ہر چیز سے شوق تھا۔ انسانیت پیاری تھی، انسان عزیز تھا۔ ان میں غیر معمولی صلاحیت تھی اور وہ خود بھی یہ جانتی تھیں۔ جس خوبی سے کسی چھوٹی سی شادی یا گھریلو تقریب کا انتظام کرتیں اس سے بھی زیادہ حسن انتظام بڑی بڑی شادیوں، تقریبوں، جوبلیوں اور دوسرے کاموں میں نظر آتا۔

قدسیہ ہر حیثیت سے بڑی خوش قسمت عورت کہی جا سکتی ہیں۔ قدرت جتنی نعمتیں دنیا میں کسی کو دے سکتی ہے سب ان کو حاصل تھیں۔ حسن، ذہانت، قابلیت، فراغت، صحت، ظرافت، محبت، شہرت ہر دل عزیزی کیا نہ تھا ان کے پاس۔ قدر دان اور عاشق زار شوہر، سعادت مند اور قابل اولاد، چاہنے والے دوست۔ ایسا انسان جتنا بھی مغرور یا خود پسند، عیش پرست اور تن آسان نہ ہو کم ہے۔ لیکن قدسیہ میں ان کمزوریوں کا دور دور پتہ نہ تھا۔ یہ نہیں کہ وہ اپنی صلاحیتوں سے آگاہ نہ تھیں بے جا انکسار بھی نہیں کرتی تھیں۔ یہ بھی جانتی تھیں کہ لوگ ان سے کس قدر متاثر ہوتے ہیں اور اس اثر سے کام لینا بھی جانتی تھیں۔ یہ بات بھی وہ سمجھتی تھیں کہ جس کام میں ہاتھ ڈالیں گی اسے کامیابی نصیب ہوگی۔ ان کے عزم کے آگے پہاڑ بھی ٹوٹ سکتا ہے۔ قدسیہ کا خیال آتا ہے تو مجھے رانی جھانسی یاد آتی ہیں۔ وہ پرانے زمانے میں پیدا ہوتیں تو چاند بی بی ہوتیں یا جھانسی کی رانی! قدسیہ نے باطل سے سمجھوتہ کرنا نہیں سیکھا تھا۔ حق کے لیے وہ ہر چیز سے ٹکر لینے کے لیے تل جاتیں اور جس کام کا بیڑا اٹھا لیتیں اس کو بہر صورت پورا کرتیں۔ وہ مزاج کی تیز اور زبان کی طرار تھیں اور اپنی ان کمزوریوں کو جانتی بھی تھیں۔ مگر ان کی دوسری صفات ایسی تھیں کہ لوگ ان کی باتوں کو برا کم ہی مانتے تھے۔ خوشامد، چاپلوسی اور مصلحت پسندی ان کی فطرت کے خلاف تھی۔ یہ سوچے بغیر کہ ان کا مخاطب کتنا بڑا صاحب اثر و اقتدار ہے۔ بے دھڑک سوال جواب کرتیں اور غصہ آ جائے تو سخت لفظوں میں جواب دیتیں۔ ایک بار اس وقت کے ایک وزیر جو بڑے صاحب اثر سیاست داں بھی ہیں، اور ان سے قدسیہ اور ان شوہر کے کافی تعلقات بھی تھے۔ جامعہ کے ایک صاحب کو علی گڑھ میں ایک ہزار روپے کی جگہ پر بلانے پر معترض ہوئے کہ جامعہ میں سو روپے پانے والے کو اتنی بڑی تنخواہ کیوں دی گئی؟ قدسیہ غصے سے بے قابو ہو گئیں اور تڑ سے جواب دیا۔ 'جی ہاں! اسی جامعہ کے ایک فرد کو جو چھتر ہی روپے تنخواہ پاتا تھا، آپ نے وائس پریسڈنٹ بنا دیا ہے۔ وہ حضرت لاجواب ہو کر منہ دیکھنے لگے۔ کمال یہ کہ مزاج میں ایک طرف چٹانوں کی سی سختی اور کھرا پن تھا تو دوسری طرف ریشم کی سی نرمی اور شہد کی سی شیرینی اور گھلاوٹ بھی تھی۔ ان کے بعض دوست ان سے کہا کرتے تھے۔

ہو حلقہ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے بھابی

لیکن ان کی سب سے اہم خصوصیت جس نے ان کو اپنوں اور غیروں سب میں بے حد محبوب بنا دیا تھا وہ تھا احساس فرض اور دردمندی۔ احساسِ فرض ایک ایسا لفظ ہے کہ جسے بہت محدود معنوں میں بھی استعمال کیا جا سکتا ہے اور انتہائی وسیع معنوں میں بھی، یہ تو اس پر منحصر ہے کہ انسان اپنے فرائض کیا سمجھتا ہے۔ بعض لوگ جو اپنی ذات کو مرکزِ کائنات سمجھتے ہیں صرف 'اپنا' ہی حق ادا کرتے ہیں یا اپنے ہاں بچوں تک احساس فرض کو محدود کر دیتے ہیں۔ مگر گنتی کے کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنے فرائض کو اپنے رشتے ناتوں میں قید نہیں کرتے اور جتنا بڑھاتے جائیں انھیں اس میں خوشی اور سکون ملتا ہے۔ قدسیہ ان ہی میں سے ایک تھیں۔ ان کے 'فرائض' کے وسیع دامن میں نہ صرف اعزا و احباب بلکہ ہر وہ شخص سما سکتا تھا جو کسی طرح ان تک پہنچ جائے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ اس اجمال کی تھوڑی سی تفصیل کروں۔

قدسیہ بیاہ کر جس خاندان میں آئیں وہ سادات بارہہ کے 'کھرے سیّدوں' کا تھا، جہاں اس وقت تک کسی غیر خاندان، غیر سادات، غیر مذہب کی لڑکی کا لانا گویا گناہ اور خاندان کے نام پر داغ سمجھا جاتا تھا۔ سید بشیر حسین زیدی کی نسبت 1928 میں سیدہ خاتون سے ہوئی تھی لیکن 1929 میں اچانک وہ فوت ہو گئیں اور کئی سال تک زیدی صاحب نے اسی صدمہ میں شادی کا خیال بھی نہیں کیا۔ ان کی والدہ، چچا، بھائیوں بہنوں سب کو بڑا ارمان تھا ان کے بیاہ کا۔ آخر 1937 میں وہ اس پر تیار ہوئے کہ بخاری کی بہن قدسیہ بیگم سے شادی کریں۔ نو مسلم کشمیری گھرانے کی لڑکی جب ایسے خاندان میں بیاہ کر آئی ہوگی تو اس کی طرف سے کیا کچھ تعصب نہ ہوگا اس کا اندازہ لگانا آج کے زمانے میں آسان نہیں۔ وہ شیعہ نہ تھیں اس کی وجہ سے تعصب کا رنگ اور گاڑھا تھا۔ اگر وہ چاہتیں تو سب جھگڑے بکھیڑوں سے بچ کر، اپنے شوہر کے ساتھ آرام سے الگ رہ سکتی تھیں۔ لیکن قدسیہ نے دیکھا کہ زیدی صاحب اپنی والدہ کے بڑے سعادت مند بیٹے اور خاندان کے دلدادہ، سرپرست اور کفیل ہیں اگر چہ کفالت اور مدد الگ رہ کر بھی کی جا سکتی تھی، مگر قدسیہ نے کٹھن راہ کو اپنا لیا اور دل میں ٹھان لی کہ اس نئے ماحول میں رہ کر، قدامت پرست گھرانے

کے افراد کو انھیں رام کرنا ہے اور جس طرح انھوں نے اس ہفت خواں کو طے کیا ہر کسی کے بس کی بات نہ تھی۔ ان کی سیرت کی پختگی اور دل کی وسعت کا پہلا اندازہ یہیں ہوا۔ ایک طرف اپنے اصولوں اور روشن خیالی کو انھوں نے خیر باد نہیں کہا۔ دوسری طرف خاندان والوں کے ساتھ اس طرح نباہ اور سلوک کیا کہ تھوڑے ہی عرصے میں ہر ایک ان کا کلمہ پڑھنے لگا۔ کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ ان کے پاس روپیہ تھا، اثر و ذرائع تھے جس کی وجہ سے وہ لوگوں کی مدد اور ان کے ساتھ سلوک کر سکتی تھیں مگر صاحب حیثیت اور صاحبان اقتدار کی تنگ دلی اور خود غرضی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ اور قدسیہ صرف مالی مدد ہی نہیں کرتی تھیں بلکہ وہ دل سے اپنے نئے رشتے داروں کو چاہتی تھیں۔ یہ ان کی بے لوث خدمت اور سچی محبت کا جادو تھا جس نے قدامت پرستی، تنگ نظری اور تعصب کو زیر کیا اور سب کے دل جیت لیے۔ اس وسیع خاندان کے سارے مسائل اب ان کے اپنے تھے۔ لڑکیوں اور لڑکوں کی تعلیم اور منگنی بیاہ، بے روزگار کو روزگار سے لگانا، بیماروں کا دوا علاج، غمزدوں کی دلداری، بچوں کی نگہداشت، نوجوانوں کی دلجوئی، روز کے آنے جانے والے مہمانوں کی میزبانی اور بوڑھی ساس کی دیکھ بھال اور خدمت، ان سب ذمہ داریوں کا بار انھوں نے اپنے کندھوں پر اٹھا لیا۔ جس کو جس وقت، جس مدد کی ضرورت ہوتی، قدسیہ اس کے لیے مستعد نظر آتیں۔ کوئی شک نہیں کہ اس میں ان کے شریک حیات کا پورا تعاون اور اعتماد بھی شامل تھا ورنہ وہ تنہا اس سے عہدہ برآ نہ ہو سکتی تھیں۔

قدسیہ سنّی خاندان کی لڑکی تھیں اور مذہب کے ظاہری ارکان کی کچھ زیادہ پابند بھی نہ تھیں۔ ابتدا میں صرف اس بات کی وجہ سے ان کو بہت کچھ سننا اور سہنا پڑا۔ مگر قدسیہ کی مزاج کی تیزی اور نیام سے نکلی تلوار کی سی صاف گوئی کی وجہ سے لوگ ان سے دبتے بھی تھے۔ مذہبی کٹر پن سے ان کو سخت چڑھ تھی۔ لیکن ساتھ ہی ان کا دل نورِ ایمان سے روشن تھا اور اس بات کا ہمیشہ خیال رکھتی تھیں کہ دوسروں کے جذبۂ عقیدت کو ٹھیس نہ لگے۔ میں نے بعض مجالس میلاد میں انھیں خوف خدا سے کانپتے دیکھا ہے۔ مجالس عزا میں آنسوؤں کا دریا بہاتے پایا ہے۔ جن لوگوں کو اس پر اعتراض تھا کہ سنی بہو اس گھرانے میں آئی ہے ان کو بھی قدسیہ کے طرزِ عمل نے شرمندہ کر دیا۔

زیدی صاحب کے والد کے زمانہ سے ان کے وطن نگرولی میں چہلم امام حسینؑ کے زمانے میں دس مجالس اربعین کی ہوا کرتی تھیں۔ شادی کے چند سال بعد ہی قدسیہ نے ان مجلسوں کی ذمہ داری اپنے اوپر لے لی اور تقریباً بیس سال تک وہ ہر زمانہ، ہر موسم میں، اپنے ہزار کام چھوڑ کر، سفر کی تکلیفیں جھیل کر، گاؤں کی کٹھن زندگی کی پروا کیے بغیر نگرولی جاتیں دس دس دن رہتیں اور بڑی عقیدت اور نہایت حسن انتظام کے ساتھ ان مجالس کا انتظام کرتیں۔ اعلیٰ پایہ کے واعظ اور ذاکر مجالس پڑھنے آتے سینکڑوں افراد خاندان اور آس پاس کے گاؤں کے لوگ مجلس میں شرکت کے لیے آتے اور قدسیہ ان کی دیکھ بھال بھی کرتیں وہاں پر وہ پردہ بھی کرتی تھیں گاؤں کی جاہل سے جاہل اور غریب سے غریب عورتوں سے بالکل برابری سے بلکہ جھک کر ملتیں، ان کے برابر بیٹھتیں، ان کے مذاق کی باتیں کرتیں، کھنکتے قہقہے لگاتیں اور ان کو یہ محسوس ہوتا کہ یہ بہو تو ہیرا ہے۔ گاؤں کی عورتیں ان کی اتنی دلدادہ تھیں کہ تعریف کرتے نہ تھکتیں۔ ایک بار ان کے شوہر نے حیرانی سے پوچھا، قدسیہ گاؤں کی عورتیں آخر تمھاری اس قدر دلدادہ کیسے ہو گئیں؟'

سادگی سے ہنس پڑیں' کچھ نہیں ڈارلنگ۔ بات بس اتنی ہے کہ یہاں کی اعلیٰ خاندان کی سیدزادیاں تو انھیں منھ ہی نہیں لگاتیں۔ میں ذرا ان بے چاریوں سے ہنس بول لیتی ہوں اس لیے وہ مجھ سے محبت کرنے لگی ہیں۔!'

ان مجالس کی ذمہ داریوں کو قدسیہ نے آخر دم تک پوری عقیدت اور لگن سے انجام دیا۔ آج ان کے سسرال اور گاؤں کا ہر فرد ان کی یاد میں آنسو بہا رہا ہے اور ہر زبان ان کی تعریف میں رطب اللساں ہے۔ ہندی عورت کا یہ ناقابل تسخیر قلعہ جس طرح قدسیہ نے فتح کیا وہ کیسا کٹھن کام تھا یہ صرف عورت ہی سمجھ سکتی ہے۔

میں قدسیہ سے ان کی شادی کے دو تین سال بعد ملی تھی۔ دونوں ہی طرف ایک عجیب سی جھجک تھی۔ جب 39ء میں ایک دن زیدی صاحب ان کو لے کر میرے گھر دلی آئے تو اگرچہ جھجک دونوں طرف باقی تھی، مگر اس خوبصورت، تیکھے نقش و نگار اور کچھ شرمائی اور گھبرائی سی اپنی ہی عمر لڑکی کو دیکھ کر اچانک میرے دل میں ان کی محبت کا ایک سوتا پھوٹا۔ اور جب اگلے سال میں چند ہفتے ان کے ساتھ جا کر رام پور رہی تو ہم دونوں محبت کے اس اٹوٹ بندھن میں بندھ گئے جو بہن اور دوست دونوں کے امتزاج سے ہی پیدا ہو سکتا ہے۔ بیس برس تک مجھ سے اور میرے شوہر سے ان کے بہت قریبی تعلقات رہے۔ عابد صاحب کو صرف 'عابد بھائی' کہتی ہی نہ تھیں، سمجھتی بھی بھائی ہی تھیں اور ان سے بڑی عقیدت رکھتی تھیں۔ اہم سے اہم مسئلے پر ان سے مشورہ کرتیں اور اکثر مان لیتیں۔ مجھ سے وہ عمر میں چند ماہ چھوٹی تھیں، مگر رشتہ بڑا تھا اور چھوٹی بہن کی طرح برتاؤ کرتی تھیں۔ اس دوستی کے ناتے، جو اتنے عرصے ہم دونوں میں رہی میں نے ان کی سیرت کو قریب سے دیکھا اور پرکھا۔ جب ملاقات ہوتی تو پھر وہی خلوص، اپنائیت

اور قربت...... ان کا دائرۂ احباب بہت وسیع تھا مگر چند افراد جن میں ذاکر صاحب، سیدین صاحب، عابد صاحب، رگھونندن سرن اور دوسرے کئی افراد شامل تھے ان سے بہت زیادہ قریب تھے اور ان کے لیے وہ سب کچھ کرنے کو تیار ہو جاتی تھیں، جو جتنا مطالبہ کرے یا جس کو وہ جتنا مستحق سمجھیں۔

قدسیہ زندگی میں جتنی آگے بڑھتی گئیں ان کے عمل کا دائرہ اور 'خاندان' وسیع ہوتا گیا۔ عزیزوں کے عزیز، دوستوں کے دوست اور عزیز، طالب علم، فن کار، شاعر ادیب، پڑوسی، ملازم سب ان کے خاندان میں شامل تھے۔ بس کسی کا اتنا کہنا کافی ہوتا 'یہ کام تو آپ ہی کریں گی۔ ہمارے بس کا نہیں، پھر قدسیہ اس کام میں جان کھپا ڈالیں گی۔ خود اپنا مذاق اڑا کر کہا کرتی تھیں۔ 'بس' کوئی مجھے چودھراہٹ دے دے پھر میں ہر کام کر سکتی ہوں' مگر اس 'چودھراہٹ' کے پیچھے نام و نمود کی نہیں خدمت کی لگن کا جذبہ ہوتا تھا۔ اب چاہے کسی رئیس یا رئیسہ کو 'ریاست' ہی دلوانے کا معاملہ کیوں نہ ہو یا کسی مستحق طالب علم کو وظیفہ دلوانا ہو، کسی بیمار کا آپریشن کرانا ہو کسی لڑکی کی شادی کی مہم درپیش ہو، یکساں شوق اور ان تھک محنت کے ساتھ قدسیہ اس فرض کو انجام دیتی تھیں۔ دیکھنے والوں کو لگتا جیسے اس عورت کو اس کے سوا اور کوئی کام ہی نہیں۔ ان کی مثال ابرِ رحمت کی سی تھی جو بے تکان برستا چلا جاتا ہے اور خود نہیں جانتا کہ کس کس کو اس سے فیض پہنچا ہے! ضرورت مند کا ان کی زد میں آنا شرط تھا کتنے لوگ ان کے چلے جانے سے بے سہارا ہو گئے، یہ کوئی نہیں جانتا اور سب سے زیادہ ان کے وہ چاہنے والے جن کو ان کی ذات سے محبت، خلوص اور اپنائیت کی دولت ملی تھی کہ سب کچھ مل جاتا ہے، چاہنے والا درد مند دل رکھنے والا دوست کہاں ملتا ہے؟

لیکن خود قدسیہ کو کبھی یہ گھمنڈ نہیں ہوا کہ کتنوں کی مدد کرتی ہوں کتنوں کا سہارا ہوں میں نے تو یہی کہتے سنا 'ہائے۔ میں۔ میں تو کچھ بھی نہ کر سکی۔ فلاں کے لیے' اور آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک آ جاتی۔ ان کا یہ انکسار اور درمندی ہی لوگوں کا دل موہ لیتی تھی ورنہ محسن سے تو عام طور پر احسان مندوں کو کچھ پرخاش ہی سی ہو جاتی ہے۔

یہ کہنا غلط ہوگا کہ ان کے مخالف اور دشمن نہ تھے۔ دنیا میں ایسا کون خوش قسمت ہے۔ بعض تو ایسے لوگ جو ان کی وجہ سے بن گئے ان کے مخالف بن بیٹھے۔ لیکن زیادہ تر یہ مخالفت ذاتی وجود سے نہیں ہوئی۔ وہ سچائی کی خاطر لوگوں کی مخالفت مول لے لیا کرتی تھیں یا ان کے بے دھڑک صاف گوئی کی وجہ سے لوگوں کو شکایت ہوتی یا کاموں میں رکاوٹ پڑتی دیکھ کر وہ راہ کے کانٹے صاف کر دیتی تھیں۔ اس کے نتیجے میں لوگ کیا کہتے ہیں، لوگ ان کے مخالف بن گئے ہیں یا دشمن، ان کو رتی برابر پروا نہ ہوتی تھی۔

ریاست رام پور ان ریاستوں میں تھی جنھوں نے سب سے پہلے جمہوریہ ہند کے ساتھ اپنے کو ضم کر دیا۔ اس میں ظاہر ہے بشیر حسین زیدی اور قدسیہ بیگم دونوں کا ہاتھ تھا۔ لیکن قدسیہ ریاست کے ماحول سے کبھی خوش نہیں رہیں۔ اور جب وہ اور زیدی صاحب دلی آ گئے، تو انھوں نے بہت سکون کا سانس لیا اور اپنی پسند کی، عمل سے بھرپور زندگی بسر کرنی شروع کی۔ لیکن چند سال بعد ذاکر صاحب کے اصرار پر زیدی صاحب علی گڑھ کے وائس چانسلر ہو کر چلے گئے۔ قدسیہ دلّی چھوڑنا نہیں چاہتی تھیں۔ اب وہ کبھی کبھی علی گڑھ چلی جاتیں زیادہ تر جامعہ میں جو مکان کرایے پر لیا تھا اس میں رہتیں اور اپنے ڈراما اور اسٹیج کے کاموں میں منہمک، اس محنت شاقہ کا اثر ان کی صحت پر پڑ رہا تھا مگر دوسروں کا کیا وہ خود بھی اس کو محسوس نہ کرتی تھیں۔

زندگی کی اس مختصر مدت میں قدسیہ نے کتنا کام کر ڈالا کتنے مداح اور محبت کرنے والے پیدا کر لیے، سوچتی ہوں تو حیرت ہوتی ہے۔ ان کی ایک رفیق کار نے مجھ سے کہا 'پانچ مردوں کے بس میں اتنا کام کرنا نہیں تھا جتنا آپا اکیلی کرتی تھیں۔' شاید ان کے دل کو خبر تھی کہ وقت تھوڑا ہے اور کام زیادہ، جتنا زیادہ سے زیادہ کام کر سکیں کر جائیں۔

ان کی جدائی کی کسک کے ساتھ ساتھ ہمیشہ مجھے یہ احساس ہوتا ہے کہ قدسیہ بڑی خوش قسمت تھیں۔ بھلا ایسی زندگی اور موت کس کو نصیب ہوتی ہے! کام اتنا کر گئیں کہ سو سال بھی زندہ رہنے پر اس سے زیادہ کیا کوئی کر سکے گا۔ ہر دلعزیزی اتنی پائی، جو لاکھوں میں سے کسی کے حصے میں آتی ہے، اپنے پیاروں کو سلامت چھوڑ کر، اپنے محبوب شوہر کی آغوش میں مسکراتے ہوئے انھوں نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ ایک تابناک زندگی اور قابل رشک موت۔

ان کا حسین مسکراتا چہرہ آفتاب سے مشابہ تھا کہ جہاں پہنچ جائیں زندگی کھل اٹھتی تھی۔ ان کا زمزمہ بار قہقہہ دلوں میں مسرت کی لہریں پیدا کر دیتا تھا۔ روشن آنکھوں کا یہ عالم تھا کہ ؏

جس طرف نظریں اٹھیں، شمع فروزاں ہو گئیں!

بھلا ایسی ہستی کے ساتھ موت کا تصور کیا بھی کیسے جا سکتا ہے! موت اس ہستی کو کیسے فتح کر سکتی ہے جس نے کسی سے زیر ہونا سیکھا ہی نہ تھا وہ تو زندہ ہیں اور رہیں گی۔ اپنے علمی، ادبی، تہذیبی کاموں کی شکل میں وہ زندہ رہیں گی۔ اپنے پیاروں کے دلوں میں، اپنے دوستوں، عقیدت مندوں اور احسان شناسوں کی یادوں میں جن کو انھوں نے ماں کا پیار، بہن کا خلوص، دوست کی الفت بے بہا نعمتوں سے مالا مال کیا۔

□□□

محمد نوشاد عالم

صغرا مہدی کا ناولٹ

'کوئی درد آشنا بھی نہیں' کا تجزیاتی مطالعہ

صغرا مہدی اردو کی معروف ادیبہ و مصنفہ رہی ہیں۔ ناول، افسانہ، سوانح عمری، تنقید وغیرہ جیسی اصناف میں ان کے قلم نے اپنا جوہر دکھایا ہے۔ معاصر فکشن نگار خواتین میں صغرا مہدی کی اپنی منفرد شناخت رہی ہے۔

صغرا مہدی کی ناولٹ 'کوئی درد آشنا بھی نہیں' ایک الم انگیز داستانِ محبت ہے۔ قصۂ دردِ الفت ہی اس کی کل کائنات نہیں۔ اس میں چند اہم معاشرتی اور عائلی مسائل کو فنکارانہ مہارت کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش موجود ہے۔

اگر ناولٹ نگار کی ابتدائی چند نگارشات کو نظرانداز کردیں تو یہ ناولٹ ان کی پہلی تحریر قرار پاتی ہے۔ لیکن ادیبہ کی زمینی حقائق اور زندگی کے اصلی اور واقعی رخ سے وابستگی کی کوشش اور تگ و دو قابلِ قدر ہے۔

'کوئی درد آشنا بھی نہیں' میں صغرا مہدی نے ایک نوجوان لڑکے اور لڑکی کے مابین پروان چڑھنے والی محبت کی کہانی کو پیش کیا ہے جو آپس میں چچازاد بھائی بہن ہیں۔ کہانی کا پس منظر بیسویں صدی کے ابتدائی دہائیوں کے ماحول سے تیار کیا گیا ہے۔ جب مسلمانوں کا روشن خیال طبقہ اشرافیہ اعلیٰ تعلیم کی قدر و قیمت سے واقف ہو چکا تھا اور اس طبقے کے نوجوان ولایتی ڈگریوں سے سرفراز ہو کر اچھی نوکریاں کر رہے تھے اور اونچی تنخواہیں پا رہے تھے۔

مگر تعلیم کا یہ رجحان اور شریف گھرانوں کی یہ خوبی ناولٹ کے ہیرو اسد کے لیے سوہانِ روح بن جاتی ہے اور اس کی وجہ سے اس کی ہیروئن علو کی زندگی تلخ ہو جاتی ہے۔ دراصل اسد اور عالیہ کا تعلق بھی شریف اور اعلیٰ تعلیم یافتہ گھرانے سے ہے۔ ان کے بھائی بہن انتہائی زیرک، ذہین اور پڑھاکو قسم کے لوگ ہیں، جو امتحانات میں بہترین نمبرات حاصل کرتے ہیں لیکن سارے بھائی بہنوں کے برعکس اسد غیر معمولی ذہانت کا حامل نہیں ہے، اس لیے وہ اچھے نمبرات حاصل نہیں کر پاتا ہے۔ عالیہ بھی اوّل درجے سے کامیاب ہوتی ہے مگر ہر وقت مطالعہ میں مستغرق رہنا اسے پسند نہیں۔

اسد اور عالیہ کا بچپن، لڑکپن اور نوجوانی ساتھ ساتھ گزرتی ہے۔ ان کی اس یک جائی میں ان کے مزاج و مذاق اور افتادِ طبع کی ہم آہنگی کو بڑا دخل ہے۔ اسد کو اپنے گھر کے ڈسپلن زدہ ماحول اور انٹیلیکچوئیل فضا سے نفرت ہے، اس لیے اسکول کے بعد اس کا زیادہ تر وقت گھر کے بزرگ نوکر ججو چچا کی کوٹھری اور آوٹ ہاوسز میں گزرتا ہے۔ عالیہ کی اپنے اکلوتے بھائی احمد سے نہیں بنتی ہے اور اس کی چچازادیاں یعنی اسد کی حقیقی بہنیں ہر وقت پڑھائی لکھائی میں منہمک رہتی ہیں۔ ایسے میں اسد اس کا رفیق بنتا ہے۔ لڑکپن کے بعد جب وہ دونوں جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے ہیں تو ان دونوں کی یہ رفاقت محبت میں بدل جاتی ہے۔ عالیہ اور اسد شادی کے ذریعہ اس رفاقت کو دوام عطا کرنا چاہتے ہیں۔ اسد کے والد اور عالیہ کے والدان کی اس خواہش کی تکمیل کے لیے تگ و دو کرتے ہیں۔ لیکن ان کا تعلیم یافتہ اور 'روشن خیال' خاندان دوسرے اور تیسرے درجے سے کامیاب ہونے والے اور معمولی یافت پر نوکری کرنے والے اسد کو بہ طور داماد قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا اور بالآخر عالیہ کی شادی دوسری جگہ کردی جاتی ہے اور اسد بھی خالدہ نامی ایک لڑکی سے نکاح کر لیتا ہے۔ لیکن عالیہ کی جدائی کا غم اسے اندرونی طور پر کھوکھلا کر دیتا ہے اور 35 رسال کی عمر میں وہ علو کو غم زدہ

چھوڑ کر ملکِ عدم کو۔۔۔جاتا ہے۔

عالیہ بیگم اس ناولٹ کی سب سے زیادہ متحرک کردار ہے۔ تاہم اس سے محبت کرنے والا نوجوان اسد بھی تقریباً اتنی ہی اہمیت کا حامل ہے۔

اس کہانی میں صغرا مہدی کی کردار نگاری کو سراہا جاسکتا ہے کیونکہ اس کے کردار بالکل مثالی اور خیالی محسوس نہیں ہوتے بلکہ گوشت پوست کے انسانوں کی طرح ان کے اذہان وقلوب پر بھی مختلف اوقات میں مختلف احساسات وجذبات کا ورود ہوتا ہے اور انسانی معاشرے کے افراد کے مانند وہ بھی متضاد رویوں کے شکار ہوتے ہیں۔ عالیہ بیگم کو تمام تر مخالفتوں کے باوجود اسد کے ساتھ شادی کے لیے بضد دِکھانا، گزشتہ صدی کی ایک گریجویٹ دوشیزہ کی روایت شکن ذہنیت کی صحیح تصویر کشی ہے۔ علو کی زبانی اس ضد کا حال یوں بیان ہوا ہے:

'میں اپنے فیصلے پر مضبوطی سے جمی تھی۔ پاپا اور بڑے ابا کے علاوہ سب لوگ مری صورت سے بیزار تھے' بیزار کی شدت کا اندازہ کرنے کے لیے علو کی ماں کا یہ جملہ ملاحظہ ہو:

''اگر تیری شادی اسد کے ساتھ ہوئی تو پھر میں تجھ سے قطع تعلق کرلوں گی۔ میں اس جیسے کم حیثیت اور نالائق لڑکے کو اپنا داماد بنانے کو ہرگز تیار نہیں ہوں۔''

پھر اُس کا حالات سے سمجھوتہ کرلینا اور ماں کی رضا پر راضی ہوجانا انسان اور بالخصوص عورت کے سمجھوتہ کن رویے کا غماز ہے۔ ساتھ ہی علو کی اس رضامندی کی وجہ اسد کا ہتھیار ڈال دینا بھی ہے۔ اسد کے خط کے یہ الفاظ دیکھیے:

'عالیہ تم اپنی ضد چھوڑ دو۔ بزرگوں سے ٹکر لینا مناسب نہیں۔ میں ان کو کبھی سکھ نہ دے سکا اب دکھ تو نہ دوں'

لیکن علو کی رضامندی کی وجوہات صرف یہی نہیں ہیں بلکہ اس میں اُس پندار کا بھی بڑا دخل ہے، جو ایک چاہنے والے کو اپنے محبت کے تئیں ہوتا ہے۔ علو کو اسد سے امید ہے کہ وہ کم از کم اس اہم ترین موقع پر بزدلی نہیں دکھائے گا اور اُسے پانے کے لیے زمانے کی مخالفت کی پروا نہیں کرے گا۔ لیکن جب ایسا کچھ بھی نہیں ہوتا تو علو خود کو وقت کے دھارے پر چھوڑ دیتی ہے۔ صغرا مہدی نے علو کی اندرونی کیفیت کو یوں اجاگر کیا ہے:

'اور جب حواس میں آئی تو میری خودداری نے کہا کہ اب اسد سے کچھ بھی نہیں کہنا اور غرور نے مجھ سے وہ کرادیا جس کا کبھی تصور بھی نہ کیا تھا۔ یعنی میں نے اماں سے کہہ دیا کہ میں ان کے حکم کے آگے سر جھکاتی ہوں اور وہ کہیں بھی اپنی پسند سے میری شادی کرسکتی ہیں۔'

صغرا مہدی نے ناولٹ میں یہ دکھایا ہے کہ عالیہ کو ان لوگوں سے شدید نفرت ہے جو اس کے محبوب اسد کی بربادی کے باعث ہوئے ہیں چنانچہ اسد کی موت کے بعد جب اس کے والد اور پھوپھی سمیت وہ سارے لوگ جنھوں نے زندگی بھر اسد سے نفرت کی تھی، اس کی قسمیں کھانے لگتے ہیں تو عالیہ کا دل چاہتا ہے کہ اسد کے ساتھ ان کا برتاؤ یاد دلا کر انھیں ان کا اصل روپ دکھائے مگر وہ برداشت کرلیتی ہے کہ اب اس کا کیا فائدہ؟ کہانی میں اس طرح کی چیزوں کی شمولیت اس کی کردار نگاری میں حقیقت پسندی کا پتہ دیتی ہے۔ بہرحال صغرا مہدی نے مختلف حربوں کے ذریعہ علو کے کردار میں جان ڈالنے کی کوشش کی ہے۔

عالیہ بیگم کے برعکس اسد کی زندگی میں ازابتدا تا انتہا یکسانیت ہے۔ صغرا مہدی نے اس کردار کے ارتقاء پر توجہ نہیں دی ہے۔ اس کی ذات جھجک، شرم وحیا اور بے اعتمادی کے حصار سے کبھی باہر نہیں آتی ہے۔ ہوسکتا ہے مصنفہ نے دانستہ طور پر ایسا کیا ہو تاکہ کہانی اپنے المناک انجام کو پہنچ سکے، خیر اس جامد کردار کی پیش کش کی وجہ کچھ بھی ہو لیکن اسد کی سادگی، سادہ لوحی، شرافت، فرماں برداری بزرگوں کے احکام کو بسر وچشم قبول کرلینا اور اپنی ذات کو دائمی کرب وبلا کے حوالے کردینا قاری کو بہت کُھلتا ہے۔ تاہم خالدہ کی رفاقت میں اس کا نئی زندگی کے آغاز کا عزم کرنا، اس میں قدرے توازن کا احساس دلاتا ہے۔ صغرا مہدی نے اس عزم کا اظہار یوں کروایا ہے:

'میں خالدہ کی دل سے عزت کروں گا اور خدا کرے تھوڑی بہت محبت بھی میں کرسکوں۔ میں اسے اپنانے کی پوری کوشش کروں گا۔'

لیکن اگر خالدہ اچھی بیوی ثابت ہوتی تو کہانی کے مذکورہ بالا انجام کے امکانات کم تھے، اس لیے مصنفہ نے خالدہ کو بھی اسد کے تئیں خیر خواہی اور ہمدردی سے یکسر باز رکھا ہے۔ ایک اور نقص جو اسد کے حوالے سے صغرا مہدی کی کردار نگاری میں پایا جاتا ہے، وہ ہے اس کردار کے اندر جذبۂ نفرت کا نہ ہونا۔ اسد اپنے اور علو کے درمیان حائل ہونے والوں سے بھی نفرت نہیں کرپاتا ہے جو کچھ عجیب معلوم ہوتا ہے۔ لیکن ہاں! جب ہم اسد کی ڈائری کے وہ اوراق پڑھتے ہیں، جنھیں اس نے اپنی موت سے چند ساعت پہلے لکھے ہیں اور جن کو نقل کرنے کے بعد ناولٹ ختم ہوجاتا ہے تو ہمیں اسد کی کردار نگاری میں نقص اور یک رُخی کا شکوہ صغرا مہدی سے واپس لے لینے کو دل چاہتا ہے۔ بلاشبہ صغرا مہدی نے اس خط کے ذریعہ اسد کی کردار نگاری کے حوالے سے اپنے اوپر وارد ہونے والے اعتراضات کا دروازہ تقریباً بند کردیا ہے۔ صغرا نے یہاں دکھایا ہے کہ اسد بھی انسانی

جذبات واحساسات سے معمور نوجوان ہے، اس کے سینے میں بھی ایک حساس دل ہے، جو اپنوں کے دیے ہوئے زخموں سے چور ہے اور سارے دوست ودشمن اور ان کا اچھا بُرا سلوک اس کے شعور کا حصہ ہیں۔ بس بات اتنی ہے کہ اس نے کسی سے کبھی بھی ان چیزوں کا اظہار نہیں کیا۔

اس ناولٹ کا ایک نسبتاً کم اہمیت کا حامل لیکن دلچسپ کردار مجو چچا ہیں۔ کہانی کے ارتقاء میں ان کا کوئی خاص عمل دخل نہیں، لیکن ان کی کوٹھری کا ضرور ہے۔ مجو چچا کے حوالے سے صغرا مہدی نے ایک صدی قبل کے ہندوستان کے معزز گھرانوں میں نوکروں کی حیثیت اور ان کے مسائل کو خیر وخوبی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اسکے علاوہ مجو چچا کے روپ میں صغرا نے ایک غریب مگر شریف النفس اور انسانیت کے قدردان شخص کو پیش کرکے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ بسا اوقات ایک سادہ اور ناخواندہ انسان اعلیٰ تعلیم یافتہ اور نجیب الطرفین لوگوں کے مقابلے میں فرد وسماج کے لیے زیادہ مفید اور کارآمد ثابت ہوتا ہے کیونکہ اس کے پاس خودساختہ معیارات نہیں ہوتے کہ حسن کے خول سے وہ باہر نہ آسکے۔ بلکہ انسانیت آدمیت اور انسان دوستی ہی ان کے لیے سب کچھ ہوتی ہیں اور وہ ہر وقت اور ہر جگہ ان چیزوں کے قدردان رہتے ہیں۔

مذکورہ بالا کرداروں کے علاوہ بھی ناولٹ میں کئی کردار ہیں مثلاً پھوپھی امّاں (اسد اور عالیہ کی بیوہ پھوپھی) حبیب چچا، بڑے ابّا (اسد کے والد) علّو کی ماں، اسد کی بہنیں رابعہ اور سلمیٰ، اسد کے بڑے بھائی اجمل اور علّو کا بھائی احمد۔ ان سبھی کرداروں کا مشترکہ عمل جو صغرا مہدی نے پیش کیا ہے وہ یہ ہے کہ اسد کی درد بھری زندگی اور المناک موت کی وجہ دانستہ یا نادانستہ طور پر یہی لوگ بنے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک اور قابل ذکر کردار علّو کے والد ہیں، جو اسد کے لیے خیرخواہی اور ہمدردی کا جذبہ اپنے دل میں رکھنے کے باوجود حقیقی معنوں میں اس کے خیرخواہ اور ہمدرد نہیں بن سکے۔ بلکہ دوسرے لوگوں کے مقابلے میں ان کا اقدام اسد اور عالیہ کے حق میں زیادہ نقصان دہ رہا کہ انھوں نے از خود شادی کی تحریک شروع کی اور اسد اور عالیہ کی دلی کیفیت جاننے کے باوجود محض بیوی کی مخالفت کی وجہ سے ہمت ہار بیٹھے۔ صغرا مہدی نے علّو کی زبانی اس کے والد کے لیے کوئی کلمۂ بد نہیں کہلایا ہے لیکن انھوں نے اس کردار کو جس طرح پیش کیا ہے۔ اس سے خود بہ خود یہ تصور ابھرتا ہے۔

صغرا مہدی نے اسد کی بیوی خالدہ کی شکل میں احساسِ کمتری میں مبتلا ایک لڑکی کو پیش کیا ہے اور دکھلایا ہے کہ کس طرح ایک نفسیاتی مریضہ اپنے اور اپنے متعلقین کے لیے وبالِ جان بن جاتی ہے۔ بہ الفاظ دیگر خالدہ اور اسد کے خاندانی ومعاشی پس منظر کو پیش کرکے ناولٹ نگار نے نکاح میں مسئلہ کفو کی اہمیت کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔

انتساب کے بعد ناولٹ نگار نے فیض کی نظم ؎

موتی ہو کہ شیشہ، جام کہ دُر
جو ٹوٹ گیا، سو ٹوٹ گیا

کے چند اشعار نقل کیے ہیں۔ کتاب کے پہلے ہی صفحہ پر یہ اشعار دیکھ کر لگتا ہے کہ شاید آئندہ صفحات میں خزاں والم اور کرب وبلا کی حکایت سے ہمارا واسطہ پڑے گا اور آنے والے اوراق میں شکست وریخت سے دوچار زندگی کے مناظر سے ہماری آنکھیں چار ہوں گی اور ناولٹ کو پڑھ لینے کے بعد یہ گمان یقین میں بدل جاتا ہے۔ بلاشبہ صغرا مہدی کی اس ناولٹ کی پوری فضا درد وغم سے عبارت ہے۔ ساتھ ہی اسد کی موت کے ذکر سے ناولٹ شروع ہوتا ہے، اس کے باوجود مصنفہ آخر تک قاری کی دلچسپی کو برقرار رکھنے میں کامیاب ہوئی ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُنھیں کہانی کہنے کے فن پر عبور ہے اور شاید صغرا مہدی کو اپنی اس صلاحیت کا احساس بھی ہے۔ ورنہ کوئی کہانی کے انجام سے اپنی تحریر کے آغاز کا خطرہ کیونکر مول لے گا؟

زیرِ نظر ناولٹ میں تقریباً پوری کہانی خودکلامی یا تصوراتی تخاطب کی صورت میں رقم ہوئی ہے۔ اسد کی موت کے بعد علّو جب دوسری مرتبہ اپنے میکے جاتی ہے اور اُسے وہاں چند دن رہنے کا اتفاق ہوتا ہے تو ان ایام میں اس کے دوست اور محبوب اسد کی یادیں رہ رہ کر اُسے بے چین کرتی ہیں اور وہ عالم تصور میں اسد سے مخاطب ہوکر اس کے ساتھ گزارے ہوئے لمحات کو یاد کرتی ہے اور اسد کی زندگی اور حالاتِ زندگی پر تبصرہ کرتی ہے۔

صغرا مہدی نے علّو کی زبانی صیغۂ واحد متکلم میں کہانی کی صورت گری کی ہے۔ خودکلامی، سوچ اور خیالی خطاب نے اس ناولٹ کی فضا کو ''بھوکا ہے بنگال'' سے قریب کردیا ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ نسیم سلیم چھتاری نے اپنے افسانے کی ہیروئن ''سمونا دیوی'' سے بہ ذریعہ خط اظہار خیال کروایا ہے اور صغرا مہدی نے علّو سے تلخ وشیریں یادوں اور خیالوں کی دنیا آباد کرائی ہے۔ ویسے تو ناول کی ابتداء صیغۂ واحد غائب میں روایت کے ذریعے ہوئی ہے مگر ساڑھے تین صفحات کے بعد صغرا نے علّو کو سوچ وفکر میں غلطاں وپیچاں کرکے صیغۂ واحد متکلم سے روایت شروع کرادی ہے۔ تقریباً ۳ صفحات کے بعد پھر صیغۂ واحد غائب سے روایت شروع ہوتی ہے اور ایک صفحہ کے بعد دوبارہ علّو کی سوچ عود کر آتی ہے۔ اس کے بعد صرف پانچ مرتبہ راوی غائب کی قصے میں واپسی ہوتی ہے۔ پہلی مرتبہ

2/صفحات میں دوسری مرتبہ آدھا صفحہ میں، تیسری مرتبہ ایک صفحہ میں، چوتھی بار 3/لائن اور آخری مرتبہ ایک صفحہ میں وہ اپنی بات کہتی ہیں۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ راوی غائب صرف علّو یعنی راوی بہ صیغۂ واحد متکلم پر قصہ گوئی یا خودکلامی کے اثناء میں طاری ہونے والی حالت وکیفیت ہی کی عکاسی کرتی ہے۔ اصل قصہ میں بالکل ہی مداخلت نہیں کرتی۔ اس ناولٹ میں استعمال ہونے والی تکنیک کے سلسلے میں یہ بات بھی ملحوظ خاطر رہنی چاہیے کہ صیغۂ واحد متکلم میں تصوراتی تخاطب کے باوجود ناولٹ میں ''شعور کی رو'' والی کیفیت نہیں پیدا ہوئی ہے، بلکہ واقعات ربط وتسلسل کے ساتھ زمانی ترتیب کے مطابق بیان ہوئے ہیں۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا کہ ناولٹ کا راوی واحد متکلم ہے لیکن اس کے باوجود صغرا مہدی نے مکالمہ نگاری کا موقع تلاش کرلیا ہے۔ وہ اس طرح کہ مختلف کرداروں کی گفتگو کوکئی جگہوں پر Direct Narration میں انھوں نے علّو کی سوچ کا حصہ بنایا ہے۔ تاہم مکالمہ نگاری میں تنوع یا ندرت نہیں ہے کیونکہ سارے ہی کردار ایک ہی طبقہ بلکہ ایک ہی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اور مصنفہ نے کہانی کی عام زبان اور مکالموں کی زبان میں فرق روانہیں رکھا ہے۔

صغرا مہدی کی زبان اس ناولٹ میں شگفتہ اور سلیس ہے۔ ناول کی واحد متکلم راوی کو انھوں نے 25/26 سال کی ایک گریجویٹ خاتون کے طور پر پیش کیا ہے جس کے لیے ناولٹ کے موجودہ اندازِ بیان کو انتہائی موزوں کہا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ ناولٹ نگار نے خود اپنی زبان یعنی راوی صیغۂ واحد غائب کی زبان کو بھی کہانی کی عمومی زبان کے مطابق ہی رکھا ہے۔

اس ناولٹ کو پڑھنے کے بعد صغرا مہدی کا جو نظریہ یا پیغام ہمارے سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ مختلف انسانوں میں مختلف صلاحیتیں ہوتی ہیں۔ سارے لوگ صلاحیتوں کی نوعیت اور معیار کے اعتبار سے یکساں نہیں ہوتے؛ لہٰذا ہر ایک سے ایک ہی طرح کے کارناموں کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ ورنہ یہ توقع توقعِ محض رہ جائے گی۔ بلکہ اس بات کا بھی قوی امکان ہے کہ ایک ہی لاٹھی سے سبھی کو ہانکنے کی کوشش میں آدمی اپنے جذبۂ ہمدردی وخیر خواہی کے باوجود دوسروں کے ساتھ ظلم وزیادتی کر بیٹھے گا۔ اس کہانی سے اخذ ہونے والا دوسرا نظریہ یہ ہے کہ نام ونمود، مال ودولت اور سامانِ آسائش ہی سب کچھ نہیں ہے۔ انسان کو ان چیزوں کے علاوہ قلب وروح کی طمانیت کے اسباب کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لیے ہر معاملہ میں صرف مادی عناصر کو دیکھنا اور روح کے تقاضوں کو یکسر نظرانداز کردینا بسا اوقات گھاٹے کا سودا ہوسکتا ہے۔ علّو کی ماں نے اپنی انّا اور علّو کی روشن مادی مستقبل کی خاطر اس کی خواہش اور پسند سے اُسے دور رکھا اور اس کی مراد پوری نہ ہونے دی نتیجتاً علّو ایک خوشحال اور مالدار شوہر کی بیوی تو بن گئی مگر اس کی روح ہمیشہ کے لیے درد وکرب کا شکار ہوگئی۔

❑❑❑

Mohd. Naushad Alam
H.No. 9-4-52/1,
Hakeempet Tolichowki
Hyderabad 500008 (Telangana)

فرہنگ آصفیہ سے

بیدمشک-ف۔ اسم مذکر۔ ایک قسم کے درخت کا نام جس کے پھول نہایت نازک اور خوشبودار، رنگ زرد مگر مایل بہ سبزی وسیاہی ہوتے ہیں۔ اس کا عرق تفریح دل اور تبرید کے واسطے استعمال کرتے ہیں۔ مزاجاً سرد تر ہے اس درخت کے پھول پتوں سے پہلے کھل جاتے ہیں۔

بیدید-ف۔ صفت (۱) ناملنسار۔ اکل کھرا (۲) بے مروّت۔ بے وفا۔ طوطا چشم اپنا مطلب نکالنے کے بعد آنکھوں پر ٹھیکری رکھ لینے والا (یہ لفظ بے اور دید بمعنی ملاقات سے مرکب ہے لیکن شعرائے عجم کے کلام میں کہیں نظر سے نہیں گزرا)۔ (۳) کٹّر۔ سنگ دل۔

پُرسا لینا-ا۔ فعل لازم۔ (عو) منہ ڈھانکنا۔ عذرخواہی قبول کرنا۔ جو شخص ماتم پرسی کرنے آئے اس کے ساتھ اہلِ میّت کا منہ ڈھانک کر رونا۔ صبر وتسلی کی باتیں سننا۔ (عورتوں میں دستور ہے کہ جب کوئی ماتم پرسی کو آتا ہے تو پہلے اہل خانہ اپنا منہ ڈھانک کر رونے بیٹھتی ہیں پھر اس کے ساتھ اور عورتیں بھی رونے لگتی ہیں۔ اہل میت اس رونے کے ساتھ میت کا کچھ بیان بھی کرتی جاتی ہیں)۔

تاویل-ع۔ اسم مؤنث (۱) بازگشت۔ واپسی (۲) خواب کی تعبیر۔ کسی خواب کا قیاسی نتیجہ (۳) کسی ظاہر المعانی فقرے کو کسی مناسبت کے باعث دوسرے معنی کی طرف منسوب کرنا۔ اصل کے خلاف بیان کرنا۔ کسی بات کو دوسری طرح بیان کرنا کسی مسئلہ کو اور طرح ڈھالنا۔ کسی عبارت کا دوسرے طور پر مطلب بٹھانا۔ حیلہ شرعی۔ یہ کلمہ لفظ اوّل سے مشتق ہے اس کے معنی ہیں کلام اوّل کی طرف رجوع کرنا۔ (۔ا) عذر بیجا۔ بچاؤ کی دلیل۔

نیلوفر یاسمین

اردو شاعری کی نمائندہ تانیثی آوازیں

آج ''تانیثیت'' ایک اہم ادبی نظریہ بن چکا ہے۔ سب سے پہلے مغرب میں اس کا وجود عمل میں آیا۔ ادبیات عالم کے ڈسکورس میں شامل ہونے کے سبب اس نے عصری ادب پر دور رس اثرات مرتب کیے۔ اٹھارہویں صدی کے دوران مغرب میں اٹھی تانیثیت کی آواز نے باضابطہ تانیثی تحریک کی شکل اختیار کرلی جو سماجی، معاشی اور سیاسی سطح پر مرد و عورت کے درمیان مساوات قائم کرنے اور امتیاز کو ختم کرنے کے لیے کوشاں ہے۔ یہ تحریک دراصل اس مرداساس معاشرے کے جبر کا ردعمل ہے جس میں عورت کی حیثیت محض محبوب کی رہی ہے جس کے ساتھ عشق تو کیا گیا لیکن خود عورت کا دل ٹٹول کر نہیں دیکھا گیا کہ اس کی بھی کچھ اپنی آرزوئیں اور تمنائیں ہیں۔ چنانچہ تانیثیت سے مراد دراصل وہ عقیدہ یا تصور ہے جس میں عورتوں کو مردوں کے مساوی اختیارات، حقوق اور مواقع کی فراہمی نیز ان کے ساتھ مردوں کے مساوی سلوک اور برتاؤ روا رکھنے کے لیے جدوجہد کی جاتی ہے۔ 18 ویں صدی عیسوی میں فرانس میں یہ ایک توانا تحریک بن کر ابھری۔ انقلابات نے اسے ہوا دی اور رفتہ رفتہ یہ تحریک ساری دنیا میں پھیل گئی۔ اس تحریک کو علمی، ادبی اور تنقیدی بلندیاں عطا کرنے میں تانیثی افکار کے حامل ادباء و شعراء نے نمایاں رول ادا کیا جس کی بدولت آفاقی طور پر سماج، سیاست اور ادب کو دیکھنے اور پرکھنے کے نظریہ میں بھی فرق آتا گیا۔

'تانیثیت'' دراصل فرانسیسی زبان کے لفظ ''فیمنزم' کا اردو ترجمہ ہے۔ بعض دانشوروں کا خیال ہے کہ یہ لاطینی زبان کے لفظ Feminism سے مستعار ہے۔ بہرحال اب لفظ فیمنزم انگریزی زبان میں مخصوص اصطلاح کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ تانیثیت مرداساس معاشرہ کے خلاف ایک سوچا سمجھا اور شعوری ردعمل ہے۔ مختلف مفکرین نے گرچہ تانیثیت کی اپنے اپنے طور پر تعریف پیش کی ہے، لیکن ان تمام مفکرین کے کہنے کا لب ولباب ایک ہی ہے وہ یہ کہ معاشرہ میں خواتین کو مساوی، سماجی، سیاسی اور معاشی حقوق فراہم ہوں اور مرد و زن کے مابین تفریق باقی نہ رہے۔

تحریک آزادی ہند کے متوازی چلنے والی تحریک نسواں نے برصغیر میں تانیثیت کی راہ ہموار کی۔ ملک کو غلامی سے نجات دلانے کے لیے تحریک آزادی سے ایک بہت بڑا فائدہ یہ بھی ہوا کہ اس سے عورتوں میں روشن خیالی اور ارادے میں پختگی آئی۔ یہی روشن خیالی دراصل اردو ادب میں تانیثی تحریک کی بنیاد بنی۔ اصلاح نسواں کے پیش نظر ناول اور افسانے لکھے جانے لگے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ خواتین کے مسائل اور ان کے حقوق پر مبنی ڈیڑھ سو سال کی معرکہ آرائی اردو ادب میں مرد دانشوروں کے قلم سے شروع ہوئی۔ نذیر احمد نے اپنے مشہور ناول 'مراۃ العروس' میں سب سے پہلے اصغری کے کردار کے ذریعہ ایک رول ماڈل تیار کیا جو اردو ادب میں ایک طویل عرصے تک دلچسپی کا باعث بنا رہا۔ نذیر احمد کے بعد ادیباؤں نے اپنی نگارشات کے ذریعے اصلاح نسواں کا بیڑا اٹھایا۔ اس سلسلے میں رشیدۃ النساء نے ناول 'اصلاح النساء' لکھا اور پھر یہ قافلہ چل پڑا۔ اکبری بیگم، محمدی بیگم، مسز عباس طیب جی، صغرا ہمایوں مرزا، عباسی بیگم، حسن بیگم شاہنواز، مسز عبدالقادر، نذر سجاد حیدر اور بیگم حجاب امتیاز علی کے ناول و افسانے شائع ہوئے مگر 'انگارے' میں ڈاکٹر رشید جہاں کے افسانوں کی اشاعت سے 1933 میں تانیثیت کو باضابطہ راہ مل گئی۔ اس راہ کو رضیہ سجاد ظہیر، ممتاز شیریں، عصمت چغتائی اور قرۃ العین حیدر جیسی معتبر خاتون فکشن نگاروں نے وسعت دی جس نے اردو شاعری کو بھی متاثر کیا۔ چنانچہ اس سمت میں ادا جعفری نے تانیثی شاعرات کی رہنمائی کی۔ وہ پہلی شاعرہ ہیں جن کے یہاں تانیثیت کے حوالے سے پہلی بار باضابطہ طور پر عورتوں کے مسائل، ان پر پابندیوں اور گھٹن کا ذکر ملتا ہے۔ ان کی شعری تخلیقات میں معاشرتی جکڑ بندیوں سے نجات پانے کی تمنا اور رہائی کا شعور شدت کے ساتھ پایا جاتا ہے۔

اس تحریک کے اثر سے بیسویں صدی کے نصف آخر میں کی جانے والی تانیثی شاعری اردو شاعری کی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس لیے کہ یہی وہ عہد ہے جبکہ اردو ادب میں ترقی پسند تحریک کے فروغ کے ساتھ تانیثیت سے متعلق خواتین کے تخلیقی جوہر کھل کر سامنے آئے۔ رشید جہاں، رضیہ سجاد ظہیر، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر وغیرہ نے عورت کی حیثیت اور اس کی نفسیات نیز اس کے درپیش مسائل کو موثر ڈھنگ سے اپنے افسانوں اور ناولوں میں پیش کیا جس سے اردو ادب میں ایک نئی جہت کا دروازہ کھل گیا۔ تقسیم ہند کے بعد اس رجحان کو مزید فروغ ملا اور نثر و نظم دونوں ہی سطحوں پر خواتین قلم کاروں نے اپنی تخلیقات

کے ذریعے اپنی اپنی ادبی شناخت قائم کی۔ یورپ اور امریکہ میں چلنے والی تانیثی تحریک کے اثرات بیسویں صدی کی چھٹی دہائی میں اردو شاعری پر بھی مرتب ہونے لگے۔ چنانچہ 1960 کے بعد اردو شاعری کا آغاز کرنے والی شاعرات کے کلام میں تانیثی نقطۂ نظر کی کارفرمائی صاف طور پر دیکھی جاسکتی ہے۔ اس ضمن میں ادا جعفری کو اولیت حاصل ہے۔ بعد کی شاعرات میں زہرہ نگاہ، فہمیدہ ریاض، کشور ناہید، پروین شاکر، شبنم شکیل، سارہ شگفتہ، نوشی گیلانی، نسیم سید، پروین فنا سید، شاہدہ حسن، فاطمہ حسن، یاسمین حمید، ثمینہ راجہ، نسرین انجم بھٹی، عشرت آفریں، شاہین مفتی، شفیق فاطمہ شعریٰ، ساجدہ زیدی، زاہدہ زیدی، بلقیس ظفیر الحسن، شبنم عشائی وغیرہ نے اپنے تخلیقی جوہر سے تانیثیت کو بلندی عطا کی۔ اردو شاعری میں تانیثیت کا یہ کارواں مسلسل رواں دواں ہے اور آج اکیسویں صدی کے ربع اول میں اب تک جن تانیثی شاعرات نے اپنی شناخت قائم کرلی ہے ان میں ثریا حسن، ممتاز مرزا، شائستہ یوسف، عذرا عباس، شہناز نبی، رفیعہ شبنم عابدی، ریحانہ عاطف، صادقہ نواب سحر، صوفیہ انجم تاج، جمیر الرحمٰن، سلطانہ مہر، پروین شیر، ترنم ریاض، سیدہ نسرین نقاش، رخسانہ جبیں، اندرا شبنم، نصرت آرا چودھری، شہلا نقوی، انوری بیگ شاہدہ نسیم سالک، گلنار آفریں، نزہت صدیقی، تسنیم عابدی، فریدہ رحمت اللہ عذرا پروین، اشرف رفیع وغیرہ خصوصی طور پر قابل ذکر ہیں۔

انھیں شاعرات میں سے چند نمائندہ شاعرات کی شاعری کا مختصر جائزہ پیش کرنے کی جسارت کر رہی ہوں۔

پروین شاکر: پروین شاکر کی پیدائش 24 نومبر 1952 کو ہوئی اور 26 دسمبر 1996 کو اس دار فانی سے رخصت ہوگئیں۔ پروین شاکر بلا کی ذہین تھیں۔ انگریزی زبان وادب میں جامعہ کراچی، ہارورڈ یونیورسٹی اور ٹرینٹی کالج امریکہ سے انھوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی۔ ان کا شعری مجموعہ ''خوشبو'' 1976 میں شائع ہوا۔ ان کا پہلا مجموعہ اتنا مقبول ہوا کہ چھ مہینے کے اندر ہی اسے دوبارہ چھاپنا پڑا۔ 'خوشبو' کے علاوہ 'صدبرگ' 1980 خودکلامی 1980 اور 'انکار' 1990 ان کے دیگر شعری مجموعے ہیں۔

پروین شاکر کی شاعری میں جذبے کی سچائی کارفرما ہے۔ ان کی فکر بلند و بالا ہے چاہے وہ عشق کے معاملات ہوں، سیاست کے یا معاشرت کے۔ وہ بہت ہی شفاف لہجے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتی ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

گھر کی دیوار ابھی میرے جانے پر
اپنی تنہائیوں کو سوچیں گی

انگلیوں کو تراش دوں پھر بھی
عادتیں اس کا نام لکھیں گی

یہ غربتیں مری آنکھوں میں کیسی اتری ہیں
کہ خواب بھی مرے رخصت ہیں رتجگا بھی گیا

ادا جعفری: ادا جعفری کی پیدائش 22 اگست 1924 کو بدایوں میں ہوئی۔ وہ ایک جاگیردارانہ ماحول سے تعلق رکھتی تھیں وہ خود لکھتی ہیں:

'میری یادوں میں کچھ تصویریں زوال آمادہ جاگیرداری نظام کی ہیں۔'

'میں ساز ڈھونڈتی رہی' 1947 'شہر درد'، 'غزالاں تم تو واقف ہو' 1972 'حرف شناسائی' 1999 ان کے شعری مجموعے ہیں۔ ان مجموعوں کے مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ان کی شاعری روایت اور جدت سے ہم آہنگ ہے۔ ان کے یہاں حقیقت نگاری کا عنصر غالب ہے حالانکہ وہ کبھی ترقی پسند تحریک سے باضابطہ منسلک نہیں رہیں۔ لیکن ان کی شاعری کے موضوعات اور اسلوب کے اعتبار سے اس تحریک کے واضح اثرات اخذ کیے جاسکتے ہیں۔ انھوں نے زندگی کی حقیقت کو شعر میں ڈھال کر اردو شاعری میں اپنا ایک بلند مقام بنایا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے۔

ہاتھ کانٹوں سے کر لیے زخمی
پھول بالوں میں اک سجانے کو

بس کہیں فصیلوں کے کچھ نشان باقی ہیں
شہر کس طرح اجڑا آگ تھی کہ دریا تھا

ہم نے سونپ دی جس کو کائنات جاں اپنی
وہ خدا نہ تھا لیکن کس قدر اکیلا تھا

کشور ناہید: 1960 میں بلند شہر میں پیدا ہوئیں۔ تقسیم کے بعد 1969 میں خاندان کے ہمراہ لاہور ہجرت کر گئیں۔ ان کا پہلا مجموعہ ''لب گویا'' 1968 میں شائع ہوا۔ اس کے علاوہ ان کے پانچ شعری مجموعے مزید شائع ہوئے۔ کشور ناہید اردو شاعری میں ممتاز حیثیت کی حامل ہیں ان کی شاعری میں عورتوں پر ہو رہے ظلم وزیادتی، ان کے دکھ درد نمایاں ہیں۔ انھوں نے عورتوں کی نفسیات کا بھرپور مطالعہ کیا ہے یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں عورتوں کا کرب صاف جھلکتا ہے۔

چھپا کے رکھ دیا پھر آگہی کے شیشے کو
اس آئینے میں تو چہرے بگڑتے جاتے ہیں

زمانے پہ نہ سہی دل پہ اختیار رہے
دکھا وہ زور کہ دنیا میں یادگار رہے

فہمیدہ ریاض: 28/جولائی 1946 کو میرٹھ میں پیدا ہوئیں۔ وہ بھی اپنے خاندان کے ساتھ ہجرت کرکے پاکستان چلی گئیں۔ ان کا تعلق ترقی پسند تحریک سے رہا ہے۔ ان کی کتابوں میں ''آدمی کی زندگی'' 1999 ''خطِ مرموز'' 2002 ''پتھر کی زبان'' 1982 ''سب لعل و گوہر'' 2011 منظر عام پر آچکی ہیں۔ وہ عورتوں کو احتجاج پر آمادہ کرتی ہیں اس لیے وہ کہتی ہیں:

وہ مجھ میں چھپا میرا گلا گھونٹ رہا ہے
یا وہ کوئی ابلیس ہے یا میرا خدا ہے

کیوں کھوٹ ہے میری زندگی میں
میں اس کا جواب دے رہی ہوں

کیوں جھوٹے ہیں میرے شب و روز
میں ان کا جواز بن گئی ہوں

ساجدہ زیدی: کا شمار اردو کی اہم شاعرات میں ہوتا ہے۔ ان کے چار شعری مجموعے ''جوئے نغمہ''، ''آتش سیال''، ''سیلِ وجود'' اور ''آتش زیرپا'' شائع ہو چکے ہیں۔ انھوں نے عورتوں کے حالات و واقعات کو بہت ہی خوبصورتی سے اپنے اشعار میں ڈھالا ہے:

ساحل پہ رک کے سوئے سمندر نہ دیکھیے
باہر سے اپنے آپ کا منظر نہ دیکھیے

اپنے وجود ہی پہ نہ گذریں کوئی شکوک
سائے کو اپنے قد کے برابر نہ دیکھیے

ہوا کی اندھی پناہوں میں مت اچھال مجھے
زمیں حصارِ کشش سے نہ تو نکال مجھے

شہناز نبی: منفرد آواز کی شاعرہ ہیں۔ ترقی پسند تحریک سے جڑی رہنے کی وجہ سے ان کے یہاں انقلاب کا ایک نیا انداز سامنے آتا ہے لیکن اس کے باوجود ان کی شاعری میں گہرائی اور ٹھہراؤ ہے۔ وہ عورتوں میں حوصلہ پیدا کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ اب تک ان کے دو شعری مجموعے 'اگلے پڑاؤ سے پہلے' 2001 اور 'پسِ دیوار گریہ' 2008 شائع ہو چکے ہیں۔

ذہن و دل کی خانہ جنگی گر یوں ہی جاری رہی
میرے اندر کی یہ لڑکی ایک دن مر جائے گی

جگ مگ چاند ستاروں کا بن اور اکیلی میں
آنکھوں میں رم جھم ساون اور اکیلی میں

سیدہ نسرین نقاش: کا تعلق کشمیر سے ہے۔ انھوں نے اردو شاعری میں اپنی ایک الگ پہچان بنائی ہے۔ اب تک ان کے تین شعری مجموعے ''لہو پکارتا ہے''، ''دہشتِ تنہائی'' اور ''روحیں چناب'' شائع ہو چکے ہیں۔ ان کی غزلوں میں عورتوں کے مسائل و میلانات واضح طور پر دیکھے جا سکتے ہیں:

کوئی آئے گا نہ مجھ سا بخدا میرے بعد
ختم ہو جائے گا دستور وفا میرے بعد

بجھ ہی جائے گا کوئی دم میں چراغ ہستی
ٹھہر جائے گا یہ طوفان بلا میرے بعد

شبنم عشائی: کا تعلق بھی کشمیر سے ہے۔ انھوں نے علی گڑھ سے تعلیم حاصل کی اور ایک نئے انداز کے ساتھ اردو شاعری میں داخل ہوئیں۔ اب تک ان کے تین شعری مجموعے ''اکیلی''، ''میں سوچتی ہوں'' اور ''من بانی'' شائع ہو چکے ہیں۔ شبنم عشائی کا سارا کمال ان کی نظموں میں ہے انھوں نے زیادہ تر نظمیں لکھی ہیں۔ ان کی نظموں میں عورت کا ایک نیا روپ دیکھنے کو ملتا ہے ایک چھوٹی سی نظم ملاحظہ فرمائیں۔

ایک روز
میں نے سجدے سے
سر اٹھایا
وہ
وہ تھا ہی نہیں
جس کو میں پوج رہی تھی

ان کے علاوہ اور شاعرات بھی ہیں جن پر تفصیل سے لکھنے کی ضرورت ہے۔□□□

Nilofer Yasmin
C/o- Perwez Akhter, Inspector/Exe
K.R.T.C.C.I.S.F., Mundali
Cuttack-754013(Odisha)

حارث حمزہ لون

بیسویں صدی کی نسائی آواز

پروین شاکر

اُردو شاعری کی پوری تاریخ میں شعرا کے مقابلے میں شاعرات کی تعداد اگرچہ کم ہے لیکن بیسویں صدی میں شاعرات کی ایک ایسی کھیپ ہمیں ضرور نظر آتی ہے جس نے اردو شاعری کے منظر نامے پر تانیثیت کے اعتبار سے واضح اثرات مرتب کیے ان میں پروین شاکر شاعری کے چمکتے آسمانوں پر ایک ایسا جگمگاتا تارا ہے جس کی چمک اور آب وتاب آنکھوں کو خیرہ بھی کرتی ہے اور اذہان وقلوب کو متاثر بھی۔ پروین شاکر کے نرم و نازک لہجے نے پاکستان کے ساتھ دنیا بھر کے لوگوں کے دلوں میں گھر کر لیا ہے۔ اردو کی تاریخ ساز شاعرہ اردو ادب میں غالب، میر اور اقبال کی طرح سب سے زیادہ پسند کی جانے والی آواز پروین شاکر سپہر کی رات رم جھم برستی بارش میں جب ایک طرف موذن نے فجر کی صدا دی تو دوسری طرف اُسی وقت یعنی 26 نومبر 1952 کو روشنیوں کے شہر کراچی (پاکستان) کے ایک اسپتال میں پیدا ہوئیں۔ بچی کا نام پروین رکھا گیا 'پروین' فارسی میں ستاروں کے ایک خوبصورت جھرمٹ کا نام ہے اپنے نام کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

''میری پیشانی کو دیکھ کے میری ماں نے میرا نام ایک تارے کے نام پر رکھا جگمگ کرنے والا تارا۔''

پروین کو پیار سے ''پارا'' یا ''پارو'' کہا جاتا تھا۔ پروین کے بچپن کی یادوں کو تازہ کرتے ہوئے ان کی والدہ ان کے عادات واطوار کے بارے میں کہتی ہیں کہ وہ بہت شوخ وشریر اور ضدی طبیعت کی مالک تھی۔ اپنی ہر بات منوا کر دم لیتی تھی۔ آئس کریم کھانے کی بہت شوقین تھی۔ کھانا کم ہی کھاتی تھی۔ مگر اچھے کھانے اسے پسند تھے۔ سیخ کباب، مچھلی پکوڑے چٹنی اس کے پسندیدہ کھانے تھے۔ اس کی طبیعت میں ایک عجیب بات یہ تھی کہ اسے ہر وقت جوتے پہنے رہنا پسند نہیں تھا۔ باہر اکثر جوتے گم کر کے آجاتی تھی۔ ایک مرتبہ کسی تقریب سے لوٹی تو اس نے لڑکوں کے جوتے پہنے ہوئے تھے۔ گاڑی چلاتے ہوئے بھی وہ اکثر جوتے اتار دیتی تھی۔ جوتے نہ پہننے والی عادت بڑے ہونے تک برقرار رہی۔ پروین شرارتیں بھی خوب کرتی، درختوں پر چڑھتی امرود توڑتی رسی پھاندتی بارش میں کھیلتی۔ پروین کو گڑیوں سے کھیلنے کا کوئی خاص شوق نہیں تھا وہ اکثر ایسے کھیل کھیلتی جن میں ذہن سے کام لینا پڑتا۔ اس سلسلے میں اختر سردار چودھری یوں رقمطراز ہیں:

''اُن کی ایک عادت یہ بھی تھی کہ جب بھی مشاعروں، محفلوں، گھر وغیرہ میں ہوتی تو اپنے پاؤں سے جوتے اُتار دیا کرتی تھی۔ عام طور پر گاڑی بھی ننگے پاؤں چلایا کرتیں۔''

انھوں نے بہت سلجھے ہوئے علمی وادبی ماحول میں شعور کی آنکھ کھولی۔ اُس گھرانے سے وابستہ لوگ علمی ذوق رکھنے کے ساتھ ساتھ مذہبی رجحان بھی رکھتے تھے۔ پروین کو اپنے نانا سے گہری محبت تھی اور اُن کی محبت سے پروین کو کتابوں سے محبت اور شاعری سے دلچسپی پیدا ہونے لگی۔ پروین بچپن میں ہی گفتگو شاعری میں کرتی اور اس طرح بہت سے اشعار زبانی یاد ہوگئے تھے۔ پروین کتابوں کا کیڑا اور مطالعہ کی بہت رسیا تھی۔ گھر میں کوئی بھی تحریر ایسی نہ تھی جو ان کی نظروں سے نہ گزری ہو۔ ان کے اس شوق کو مدِ نظر رکھتے ہوئے شاکر صاحب مذہبی موضوعات پر مشتمل کتابیں ان کے لیے لاتے رہتے تھے۔ وہ بچوں کے رسالے پڑھتی تھی اس طرح گھر کا ماحول گھر کی خاموش تربیت ان کے فکر ونظر پر اثر انداز ہوتی رہی۔

یہ بات آگے چل کر صحیح ثابت ہوئی کہ وہ ایک دانشور بن کر دنیا کے سامنے آئیں اور انھوں نے اردو شاعری کو نئے امکانات سے روشناس کرایا۔

پروین شروع سے ہی زیادہ حساس اور نازک مزاج تھیں۔ کوئی بات مزاج کے خلاف ہو جاتی تو ان کا موڈ خراب ہو جاتا۔ وہ چیزوں کو سلیقے سے رکھنے کی عادی نہیں تھیں۔ تین سال کی عمر میں پروین کو اپنی بڑی بہن نسرین کے ساتھ نزدیکی اسکول بھیجا گیا۔ بچپن سے ہی ہر ادا سے ذہانت و فطانت کا اظہار ہوتا ہے، جس کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ تیسری کلاس سے انھیں دوہری ترقی ملی اور وہ اپنی بہن کے ساتھ پانچویں کلاس میں آگئیں۔ انھیں اکثر انعامات اور ٹرافیاں ملتی رہتی تھیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ پروین بچپن ہی سے غیر معمولی صلاحیتوں کی مالک تھیں اور دوسرے بچوں سے بالکل الگ تھلگ دکھائی دیتی تھیں۔ کلاس میں ہمیشہ اول آتی تھیں۔ ان کا تعلیمی ریکارڈ کافی شاندار رہا ہے۔ پروین ذہانت و قابلیت کے بل بوتے پر اپنے اہل خانہ کے لیے باعثِ فخر تھیں۔ پروین شاکر شیعہ خاندان سے عقیدت رکھتی تھیں۔ شیعہ خاندان کی یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ آنکھ کھولتے ہی بچے کی شناسائی انیس و دبیر کے مرثیوں کے ذریعے ردھم لے جذبے احساس سوز اور دکھ سے ہو جاتی ہے۔ اس طرح اوائل عمری ہی سے انیس و دبیر کا کلام سُن سُن کر پروین نے لفظوں کی خوشبو کو سونگھا، لفظوں کے ذائقے کو محسوس کیا۔ اُن پر جملے کا جمال اور حرف کی حرمت کے در وا ہوتے چلے گئے۔ مجالس کے ماحول سے انھیں لفظوں کی طلسمی قوت کا اندازہ بھی ہوا اور انھوں نے لفظوں سے اپنا رشتہ جوڑ لیا۔ مرثیے اور سوز خوانی کے ماحول نے ان کے تخلیقی ذہن کو نمو دی۔

بحیثیت شاعرہ پروین بے حد کامیاب رہیں لیکن بحیثیت بیوی وہ کامیاب نہ ہو سکیں۔ زندگی کے ہر میدان میں کامیابیاں و کامرانیاں ان کے قدم چوم رہی تھیں۔ نئی منزلوں کو چھونے کی امنگ اور قابلیت کے بل بوتے پر پروین نے ہر میدان میں کامیابی حاصل کی۔ سرکاری عہدہ، حسن، عزت، شہرت، ملک و بیرون ملک سفر، تعریف و توصیف سب کچھ ہوتے ہوئے بھی ایک کمی کا خلا کا احساس بدستور موجود تھا۔ ان کی گھریلو زندگی انتشار کا شکار تھی۔ پروین بڑے عہدے پر فائز ہونے کے ساتھ ساتھ مشہور شاعرہ اور ستم بالائے ستم خوبصورت بھی تھیں۔ ہمارے معاشرے میں باہر کام کرنے والی عورت کا خوبصورت ہونا خود اس کے لیے کافی مسائل کا باعث بنتا ہے۔ پروین جیسی حساس عورت جو دوسروں کے درد محسوس کر کے تڑپ اٹھتی تھی جنھیں چڑیوں کے گھونسلے کا ٹوٹنا تکلیف دیتا تھا۔ خود اپنے آشیانے کے بکھرنے پر شریک حیات کے بچھڑنے پر کس صدمے سے گزری ہوں گی اس کا اندازہ کوئی دوسرا نہیں کرسکتا۔

میرے گھر کو یہ کس کی نظر لگ گئی اے خدا
کیسی کیسی دعاؤں کے ہوتے ہوئے بد دعا لگ گئی اے خدا

جب ستارے ہی نہیں مل پائے
لے کے ہم شمس و قمر کیا کرتے

گھر کے مٹنے کا غم تو ہوتا ہے
اپنے ملبے پہ کون سوتا ہے

پروین سمجھتی تھیں کہ زندگی آرام طلبی اور عیش پرستی کا نام نہیں ہے۔ بلکہ ان کے نزدیک زندگی ایک طرح کی مہم جوئی ہے۔ ان کا خیال تھا کہ کسی بھی مقام کو اپنی منزل سمجھ کر رکھنا نہیں چاہیے بلکہ اقبال کی فکر کی طرح نئی دنیا کی تلاش نئی منزلوں کی جستجو انسان کا مطمع نظر ہونا چاہیے۔ وہ ایسی زندگی ناپسند کرتی تھیں جو بالکل سپاٹ ہو جس میں کوئی تبدیلی کوئی ہلچل نہ ہو۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ وہ ساری زندگی ایک استاد کی حیثیت سے گزار دیں۔

پروین شاکر کی شخصیت میں بہت سی خوبیاں پائی جاتی تھیں، وہ شاعرہ ہونے کے ساتھ ساتھ نرم دل، ہمدرد، بیدار مغز، مہذب، حساس اور ذہین خاتون تھیں۔ زندگی کے مختلف موڑوں کو انھوں نے ایک ربط دینے کی کوشش کی ہے۔ ان کے اشعار میں ایک لڑکی کو بیوی، ماں اور آخر میں ایک عورت تک کے سفر کو صاف دیکھا جاسکتا ہے۔ وہ ایک بیوی کے ساتھ ساتھ ماں بھی تھیں، شاعرہ بھی اور روزی روٹی کمانے کی ذمہ دار بھی۔ انھوں نے ازدواجی محبت کو جتنے مختلف پہلوؤں سے چھوا اتنا کوئی مرد شاعر اگر چاہے بھی تو نہیں چھوسکتا۔ انھوں نے جنسی تعلقات، حمل، بچوں کی پیدائش، وصال اور طلاق جیسے موضوعات کو چھوا جس پر ان کے ہم عصر مرد شاعروں کی نظر کم ہی پڑی ہے۔ ماں بننے کے تجربے پر تو خواتین شاعرات نے لکھا ہے لیکن باپ بننے کے احساس پر کسی مرد شاعر کی نظر نہیں پڑی ہے۔ اکیسویں صدی کے بچوں کے شعور پر تبصرہ کرتے ہوئے وہ لکھتی ہیں:

جگنو کو دن کے وقت پرکھنے کی ضد کریں
بچے ہمارے عہد کے چالاک ہوگئے

اُردو شاعری کی خواتین شاعرات میں پروین شاکر کو اہم مقام حاصل ہوا ہے کیونکہ انھوں نے نسائیت کے مخفی جذبات کو بے باکی کی زبان دی۔ پروین شاکر کی شعری کائنات غزل اور نظم دونوں سے عبارت ہے اگر ایک طرف انھوں نے اپنے خیالات کو غزلوں کا پیراہن دیا ہے تو دوسری

طرف اپنی فکر کی نظموں کے سانچے میں ڈھال کر شہرِ سخن کو جلا بخشی ہے۔
پروین شاکر اردو شاعری میں منفرد لب ولہجہ، آہنگ کے لیے پہچانی جاتی ہیں۔ان کی شاعری خواتین کے لطیف جذبات،نفسیات کی بہترین عکاسی کرتی ہیں۔موضوع وہی پرانا لیکن انداز بیان بالکل جدا اور انوکھا ہے۔ان کا پہلا مجموعہ 'خوشبو' میں کنواری اور نوعمر لڑکیوں کے عشقیہ جذبات کی بہترین عکاسی کی گئی ہے ۔عورت کی چھوٹی چھوٹی خواہشوں، محرومیوں جیسے بہت سے تجربوں کو بڑے فنکارانہ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ پروین شاکر کو زبان وبیان پر بڑی قدرت حاصل ہے۔ اسی لیے وہ معمولی خیالات اور تجربات کو اتنی خوبصورتی سے بیان کرتی ہیں کہ شاعری کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے۔'خوشبو' میں بیان کیے گئے زیادہ تر اشعار میں عورت کے عشقیہ جذبات، ناپختگی، خودسپردگی، بےبسی اور خوداعتمادی وغیرہ جیسے جذبات کی عکاسی کی گئی ہے۔بطور مثال چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں:

میں سچ کہوں گی مگر پھر بھی ہار جاؤں گی
وہ جھوٹ بولے گا اور لا جواب کردے گا

وہ میرے پاؤں کو چھونے جھکا تھا جس لمحے
جو مانگتا اسے دیتی ، امیر ایسی تھی

تجھے مناؤں کہ اپنی انا کی بات سنوں
الجھ رہا ہے مرے فیصلوں کا ریشم پھر

شعروں میں ان کی زبان سادہ ہو یا ادبی لیکن ان کی شاعری میں صبر وتحمل کو کافی ترجیح دی گئی ہے۔ بیسویں صدی کی چھٹی دہائی کے بعد نسائی شاعری ایک نئی شناخت کے ساتھ اُردو کے ادبی منظر نامے پر جلوہ افروز ہوئی۔ پروین شاکر ہمیں اس منظر نامے پر ماہ تمام کی طرح چمکتی دکھائی دیتی ہیں۔ اپنی اولین کتاب 'خوشبو' کی اشاعت سے پہلے ہی پروین شاکر کا شمار صفِ اول کی شاعرات میں ہونے لگا تھا۔ خوشبو کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ پہلی اشاعت کے چھ ماہ بعد ہی اس کا دوسرا ایڈیشن آ گیا۔ پروین سے پہلے کسی شاعرہ نے نسوانی جذبات کو اتنے خوبصورت اور بے باک انداز میں قلمبند نہیں کیا تھا۔ اُن کی شاعری اردو شاعری میں ایک تازہ ہوا کے جھونکے کے مانند تھی۔ انھوں نے ضمیر متکلم (صنف نازک) کا استعمال کیا جو اردو شاعری میں بہت کم کسی دوسری شاعرہ نے کیا ہوگا۔ پروین نے اپنی شاعری میں جہاں محبت کے صنف نازک کے تناظر کو اجاگر کیا وہیں مختلف سماجی مسائل کو بھی اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ محبت کی خوشبو کو اپنے اشعار میں سمونے والی شاعرہ جب اُداس ہوتی ہے تو کچھ اس طرح کہتی ہے:

بڑھتی جاتی ہے کشش وعدہ گرہستی کی
اور کوئی کھینچ رہا ہے عدم آباد سے بھی

ظلم کی طرح اذیت میں ہے جس طرح حیات
ایسا لگتا ہے کہ اب حشر ہے کچھ دیر کی بات

پروین شاکر کا پہلا مجموعہ 'خوشبو' نوعمر لڑکیوں کے جذبات کی عکاسی کرتا ہے، لیکن اس کے بعد کے سارے مجموعوں میں نسائی فکر اور نفسیاتی تجربات میں پختگی آتی گئی اور ان کی نظموں کا لب ولہجہ مزاحمتی ہو کر انکار کی منزل تک جا پہنچا۔ عورت کے درپیش مسائل ان کی نظموں کے موضوع بنتے گئے۔ پدری نظام جبر کے تحت متوسط طبقے کی پڑھی لکھی اور گھریلو عورت کے ساتھ ہو رہے استحصال کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ ان کی نظم 'بشیرے کی گھر والی' میں عورت کی کیا حقیقت ہے، اس کے وجود کو صرف ایک ایسی مشین سمجھا جاتا جو جذبات وخواہشات سے عاری ہے۔ جسے ہر مرد اپنی مرضی کے مطابق استعمال کرنا چاہتا ہے۔ اس نظم سے چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں:

ہے رے تیری کیا اوقات!
دودھ پلانے والے جانوروں میں
اے سب سے کم اوقات
پُرش کی پسلی سے تو تیرا جنم ہوا
اور ہمیشہ پیروں میں تو پہنی گئی
سولھواں لگتے ہی، ایک مرد نے اپنے من کا بوجھ
دوسرے مرد کے تن پہ اتار دیا
بس گھر اور مالک بدلا، تیری چاکری وہی رہی
بلکہ کچھ اور زیادہ، اب تیرے ذمے شامل تھا

(بشیرے کی گھر والی۔ انکار، ص۔155)

پروین شاکر کی شاعری میں اداسی ، درد وکرب ، بے چینی جیسے محسوسات کا تعلق براہ راست اُن کی اپنی ذات سے بھی ہے اور ملک کے سیاسی وسماجی حالات اور قتل وغارت گری کے نتیجے میں پیدا شدہ غیر یقینی صورت حال سے بھی جس کا ذکر وہ اپنی سبھی شعری مجموعوں میں کر چکی ہیں۔ نظم کے آخری حصے میں شاعرہ عورت کو جھنجھوڑ کر بیدار کر رہی ہیں کہ وہ کب تک قربانی کا بکرا بنی رہے گی اپنی ذات کی اہمیت کا احساس کرنا کب سیکھے گی۔

پورے دنوں سے گھر کا کام سنبھالتی رہی
پتی کا ساتھ، بس بستر تک، آگے تیرا کام
کیسی نوکری ہے، جس میں کوئی چھٹی نہیں
کن کرموں کا پھل ہے تو، تن بیچے تو کسبی ٹھہرے
من کا سودا کرے اور پتنی کہلائے
ایک نوالہ روٹی، ایک کٹورے پانی کی خاطر
دیتی رہے گی کب تک تو بلیدان

(بشیرے کی گھر والی۔ انکار ص۔ 155)

پروین شاکر کی یہ نظم متوسط طبقے کی عورت کا المیہ ہے۔ ان کی نظموں میں کوئی نظریہ فلسفہ نہیں ہے، پھر بھی متوسط طبقے کی خواتین کی نفسیات، جذبات اور تاثرات کی ترجمانی کی گئی ہے۔ ان کی نظمیں ذاتی تجربات و مشاہدات کا نتیجہ معلوم ہوتی ہیں، اسی لیے حقائق اور فطرت سے قریب نظر آتی ہیں۔ پروین شاکر کی نظموں کے متعلق آغا ظفر حسنین لکھتے ہیں:

'پدری جبر کے حوالے سے پروین کی نظموں کے سلسلے میں مجموعی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان میں متوسط طبقے کی ایک تعلیم یافتہ گھریلو قسم کی عورت کی گھٹن کا اظہار ہوا ہے۔ ایک دو نظموں سے قطع نظر ان کے موضوعات کا دائرہ بہت محدود ہے۔ پاکستان کے مخصوص حالات کو بھی کسی نظم کا موضوع نہیں بنایا گیا ہے لیکن اس کے باوجود پروین کی شاعری نہایت Powerful ہے اور اس کی سب سے بڑی وجہ میرے نزدیک ان کے لب و لہجے کا فطری پن ہے'

(مزاحمت اور پاکستانی اردو شاعری: ڈاکٹر آغا ظفر حسنین، ص۔ 291)

پروین کی غزلوں کے کئی اشعار ایک بے پایاں اضطراب و بے چینی کی نشاندہی کرتے ہیں جس کی وجہ ظلم و جبر اور ناہمواریاں ہیں جس کا نشانہ معاشرے کے افراد بنے ہوئے ہیں۔ قاتل کے خونی ہاتھ ایک ایک فرد کو موت کی نیند سلا رہے ہیں لیکن اُس کی پیاس بجھنے کا نام نہیں لے رہی۔

میں بچ بھی جاؤں تو تنہائی مار ڈالے گی
مرے قبیلے کا ہر فرد، قتل گاہ میں ہے

بچھڑنے والے اتنے ہوگئے ہیں شہر در شہر
کہ باقی اب کسی گھر میں عزاداری نہیں ہے

پروین کے یہاں روایتی عشق کی واردات کی عکاسی تو ضرور ہے مگر خیال کی شگفتگی اور اسلوب کی ندرت روایت کی تپتی زمین پر برسات کی وہ پھوار ہے جو دھرتی کو سوندھی سی مہک سے آشنا کر دیتی ہے۔ محبت جہاں انسان کو مجبور بنا دیتی ہے تو وہاں انسان کو مغرور بھی کر دیتی ہے۔ اُن کے یہاں محبت کے جذبے کی تشریح اس انداز میں ہوتی ہے کہ یہ جذبہ جب اپنی انتہا کو پہنچ جاتا ہے تو یہ کیفیت جنم لیتی ہے:

میں تجھ کو دیکھ نہ پاؤں تو کچھ ملال نہیں
تمام راستہ بے سائباں گذرتا رہے

کسی کی یاد میں ڈوبا ہوا دل
بہانے سے مجھے بھی ٹالتا ہے

جو بادلوں سے بھی مجھ کو چھپائے رکھتا تھا
بڑھی ہے دھوپ تو بے سائبان چھوڑ گیا

پروین شاکر کے پانچوں شعری مجموعے جواب تک منظر عام پر آچکے ہیں۔ اُن میں غزلوں کی نسبت نظموں کی تعداد کافی زیادہ ہے۔ نظمیں لکھنے سے انھیں کافی دلچسپی رہی ہے اور اس میں وہ کامیاب بھی رہی ہیں، نظموں میں انھوں نے اپنی سوچ و فکر کو زیادہ واضح اور بہتر طریقے سے اجاگر کیا ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اُن کی شہرت نظموں کی بہ نسبت غزلوں سے ہوئی ہے۔ اُردو زبان کے مشہور استاد اور محقق ڈاکٹر ابوالخیر کشفی نے پروین کی نظم نگاری کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے:

'پروین کی بیشتر نظمیں اُس کی اپنی ذات، اُس کے محبوب، اور اُس کی پھیلی ہوئی کائنات کا مطالعہ تذکرہ اور صحیفہ ہیں۔ ان نظموں میں بے حد پھیلاؤ اور بے حد ارتکاز ہے۔ یہ یکجائی آپ کو آسانی سے کسی اور جدید فن کار کے ہاں نہیں ملے گی'۔

(مضمون اک خوشبو بھی جوا ڑ گئی، مصنف آغا مسعود حسین، ص۔ 137)

پروین شاکر کے پانچوں مجموعے ان کی شخصیت کے ایسے سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں جن کے ذریعے قاری ان کی شخصیت اور فکر و فن تک رسائی حاصل کرسکتا ہے۔ اُن کے شعری مجموعوں کے نام ہیں: ''خوشبو'' 1977، ''صد برگ'' 1981، ''خود کلامی'' 1984، ''انکار'' اور ''کفِ آئینہ'' 1994۔ پروین کا کلیات 1994 میں ''ماہِ تمام'' کے نام سے شائع ہوا۔ وہ شاعری کی دنیا میں ایک عہد آفریں شاعرہ بن کر ابھریں اور اپنے نسوانی اسلوب سے اردو شاعری میں ہلچل مچادی۔ پروین شاکر کی شاعری میں چونکا دینے والے صنفِ نازک کی بے چارگی اور بے بسی کا درد بھرا ہوا ہے، وہ اس ہرنی کی مانند ہے جو چاروں طرف سے شکاریوں سے گھر چکی ہو اور بے چارگی اور بے بسی سے تھکنے کو گزر رہی ہو۔ پروین شاکر

کی شاعری انسانیت سے محبت کا درس دیتی ہے۔ ایک دانش ور اور فلاسفر کی طرح اپنے آس پاس کے مسائل کا مشاہدہ اور تجزیہ کرتی ہے، زبردستوں کے ہاتھوں زیردستوں کے استحصال کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتی ہے۔ انھوں نے غریب طبقے کی زندگی کو درد بھری نظروں سے دیکھا اور محسوس کیا ہے۔ عہد حاضر کے حالات سے دم بخود ہونے اور زندگی کے بوجھ کو ڈھوتے رہنے کے کرب کا اظہار ان کی شاعری میں نظر آتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ پروین شاکر اپنے عہد کے شعری منظر نامے میں قد وقامت کے اعتبار سے اپنی ہمعصر شاعرات میں نمایاں اہمیت کی حامل ہیں۔ ان کی شاعری ایک نئے ذائقے اور نئے طرز احساس کی شاعری ہے۔ اُن کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے ابتداء سے ہی اپنا ایک منفرد اسلوب اختیار کر لیا تھا جو اُن کی پہچان بن گیا۔ یہی جدید اور منفرد لہجہ انھیں سب سے الگ کرتا ہے۔ ان کی زندگی کے بیالیس سالہ سفر کا اختتام 26 دسمبر 1994 کو اسلام آباد میں ایک سڑک حادثے میں ہوا۔ پروین شاکر کی شاعری میں ان حقیقتوں کا سلسلہ چلتا رہتا اگر موت کے بے رحم ہاتھ اُن کا قلم نہ روک دیتے، جو اپنی پشت میں موت چھپائے خالی ہاتھ آئی تھی اور جس کی خبر اُن کے شعری وجدان نے انھیں پہلے ہی کر دی تھی۔

مر بھی جاؤں تو کہاں لوگ بھلا ہی دیں گے
لفظ میرے، مرے ہونے کی گواہی دیں گے

□□□

Haris Hamzah Lone
R/O: Rehmatabad Watergam
Rafiabad, Tehsil Watergram, Rafiabad
Post Office: Chatloora Rafiabad
Dist. Baramulla-193303 (J&K)

Subscription Form "Mahnama Khwateen Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'ماہنامہ خواتین دنیا' کا/کی سالانہ خریدار بننا چاہتا/چاہتی ہوں۔

100 روپے کا ڈرافٹ/منی آرڈر.................... بتاریخ ....

بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِ تعاون سالانہ -/100 روپے 90092010045326 :IFSC: SYNB0009009، A/C

میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'ماہنامہ خواتین دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

پتہ : ....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون:011-26109746 فیکس:011-26108159, E-mail.:sales@ncpul.in

دستخط

شیریں نیازی

دیوتا اور مندر

کیرتی جب گھر پہنچی تو شام کے سائے اپنے پر پھیلا چکے تھے۔ تالاب کے پانی پر چاند اتر آیا تھا۔ مرغیاں اپنے اپنے ڈربوں میں گھس کر اپنے پروں میں منھ چھپا کر سونے کی کوشش کر رہی تھیں۔ بیچ بیچ میں ان کے ننھے ننھے چوزے چوں۔ چوں۔ پکار اٹھتے تھے۔ آنگن میں اپلوں کی مہک پھیل رہی تھی اور دالان کچھ دھواں دھواں سا تھا۔ اس کا پتی دالان میں بچھی کھاٹ پر لیٹا چولہے سے اٹھتے دھوئیں کو تاک رہا تھا۔

’آج بہت دیر کر دی؟ کہاں چلی گئی تھیں تم‘؟ پتی کی آواز میں تھوڑا غصہ تھا۔

’ظاہر ہے کہیں گھومنے پھرنے، سنیما دیکھنے نہیں گئی ہوں گی۔ میم صاحب کی طبیعت خراب ہے دیر سویر تو ہونا ہی ہے او پھر مجھے بھی.....‘ آگے کہتے کہتے وہ رک گئی۔ وہ بتانا چاہ رہی تھی کہ آج اسے بھی چکر آ رہے تھے۔ میم صاحب کے ساتھ صاحب اسے بھی اسپتال لے گئے تھے اور وہاں جا کر اسے پتہ چلا کہ.....نہیں نہیں یہ بات تو اسے ابھی نہیں بتانی ہے۔ ابھی تو بڑے صاحب کی آفر پر اسے غور کرنا ہے۔

’آج پھر مجھے ڈالے پر کھڑے ہو کر آنا پڑا۔ ٹرک کے ڈالے پر۔ کوئلوں کے ساتھ، یہ سب انھیں دکھائی نہیں دیا کہ میرے چہرے پر کوئلوں کی دھول جمی ہوئی ہے، میرے بال بکھر گئے ہیں، جوڑا کھلا ہو گیا ہے۔

بڑے صاحب کے آفر کے باوجود میں ان کے ساتھ نہیں آئی اسپتال میں تو میم صاحب ساتھ تھیں۔ پر یہاں تو ہم کو چھوڑنے اکیلے ہی آتے اور پھر ان کے جیسے فرشتے کو بھی لوگوں کی بولیوں کا نشانہ بننا پڑتا۔

سچ تو یہی تھا کہ کیرتی جو بھی کر رہی تھی اپنے شوہر اور بچیوں کی خاطر، ورنہ اسے باہر نکل کر کام کرنے کا کوئی شوق نہیں تھا۔

شوہر اور تینوں بیٹیوں کو روٹی بھی نہ ملتی اگر وہ کام نہ کرتی۔ چار سالوں سے پورے پریوار کا بوجھ اس کے کاندھے پر آ پڑا تھا۔ اس سے پہلے راگھو بھی ایک پرائیوٹ فیکٹری میں کام کرتا تھا۔ مگر اچانک فیکٹری بند ہو گئی۔ کارن کا پتہ تو نہ چلا مگر سارے مزدور بیکار ہو گئے اور ادھر اُدھر دوسرے شہروں میں جا کر محنت مزدوری کرنے لگے۔ کچھ سی سی ایل کی کوئلہ کھانوں میں عوضی مزدور بن گئے۔ جو کھانوں کے اندر جانے کا حوصلہ رکھتے تھے انھیں میں راگھو بھی تھا۔

کچھ سی سی ایل کرمچاری جو مائنس کے اندر اترنے سے کتراتے تھے۔ اپنی جگہ کسی اور کو اندر بھیجا کرتے تھے۔ حاضری کے رجسٹر پر ان کا نام ہوتا تھا۔ اندر جا کر بلاسٹنگ جیسا خطرناک کام کوئی اور کرتا تھا۔ اس کے بدلے وہ لوگ اپنی بیسک کا ایک حصہ انھیں دے دیا کرتے تھے۔ مثال کے طور پر اگر کسی کا بیسک چھ سو روپے ہے تو اس میں سے ڈیڑھ سو تو اندر جانے والے کو ملیں گے ہی جو کہ دیہاڑی مزدوری سے کچھ زیادہ ہی ہیں۔ بے نام موت پر معاوضہ ملے نہ ملے۔ جب تک سانس تب تک آس کے مصداق۔ یہ کام ہوتے رہے ہیں۔

سو ایسے ہی ایک دن مائنس کے اندر کوئلے کی دیواروں میں بلاسٹنگ کے لیے سوراخ بناتے ہوئے کوئلے کی ایک بڑی سی چٹان ٹوٹ کر راگھو کے پیروں پر گر پڑی تھی اس کے دونوں پیر بری طرح کچل گئے تھے۔ سی سی ایل کے ہاسپٹل میں کئی مہینوں تک علاج چلا۔ زندگی تو بچ گئی مگر دونوں پیر بیکار ہو گئے۔ تب سے اب تک پورے پریوار کا بوجھ کیرتی پر

ہے۔ شروع میں تو کیرتی کو مائن سے نکلے مزدوروں کو پانی پلانے کا کام ملا جس سے بہت کم پیسے ملتے تھے اور اس سے گزارا نہ ہوتا تھا۔ پھر اس نے پڑوس کے ایک گھر میں جھاڑو برتن کا کام کرنا بھی شروع کیا۔ ساڑھے چار سو روپے ماہوار پر۔ دونوں جگہ ملا کر تقریباً ڈیڑھ ہزار روپے کی آمدنی ہوتی تھی۔ اوپر سے جھاڑو برتن میں تھوڑی دیر سویر ہو جائے تو الگ ہی کچ کچ۔ ایسے میں بڑے صاحب جب دوسری کولکری سے پروموشن کے ساتھ ٹرانسفر ہو کر اس علاقے میں آئے تو جیسے تپتی ہوئی زمین کو سائبان مل گیا۔

ہفتے دو ہفتے میں انھوں نے کیرتی کے حالات معلوم کر لیے۔ بہت دنوں سے انھیں ایسی بھلی عورت کی تلاش تھی میم صاحب کے لیے جو انھیں خوش رکھ سکے ان کی خدمت کر سکے اور پھر وہ اسے گھر لے آئے۔

شادی کے دس سال بعد بھی میم صاحب اولاد کی دولت سے محروم تھیں بہت علاج کے باوجود ان کی گود نہ بھر سکی ان کی اُداسی اور ایبنارملیٹی کی وجہ ہی تھی کہ وہ تھوڑی چڑچڑی بھی ہو گئی تھیں۔ کیرتی کو دیکھ کر بڑے صاحب کے دل میں اچانک ہی یہ خیال بس گیا تھا کہ کیرتی ان کی میم صاحب کو دکھوں کے سمندر سے باہر نکال سکتی ہے۔ اور ایسا ہوا بھی۔ میم صاحب کے اندر تھوڑی تبدیلی آ گئی تھی وہ ہنسنے بولنے لگی تھیں۔ کبھی کبھی کیرتی اپنی چھوٹی بیٹی کو اس کی اسکول کی چھٹی کے دن اپنے ساتھ لے آتی تھی۔ میم صاحب اسے پیار کرنے لگی تھیں۔ اس دسہرے پر انھوں نے بچی کے لیے ایک خوبصورت سی فراک بھی بنوا دی تھی۔

اسی بیچ ایک دن میم صاحب کے پیٹ میں تیز درد اٹھا۔ درد کے مارے وہ بے ہوش ہو گئیں۔ ہاسپٹل لے جایا گیا۔ کیرتی بھی ساتھ گئی تھی اور وہاں جانچ پڑتال کے بعد جو معاملہ سامنے آیا۔ اس نے بڑے صاحب کے ساتھ ساتھ کیرتی کے بھی ہوش اڑا دیے۔ ان کے پیٹ میں ایک خطرناک ٹیومر پل رہا تھا جو کسی بھی وقت پھٹ سکتا تھا۔ اس کا آپریشن ضروری تھا۔

اور میم صاحب اس ٹیومر کو اپنا بچہ مان رہی تھیں۔ ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ ان کے ساتھ زبردستی بھی نہیں کی جا سکتی کہ ان کی جان کو خطرہ ہے۔ دونوں صورتوں میں معاملہ بے حد خطرناک ہے۔ جس امید کو لے کر وہ جی رہی ہیں وہ اگر ٹوٹ گئی تو یہ صدمہ برداشت نہیں کر پائیں گی۔ ان کی سانسوں کی ڈور ٹوٹ جائے گی۔ اگر قسمت سے زندہ بچ بھی گئیں تو 'ڈیپ کوما' میں چلی جائیں گی۔ ان کا علاج یہی ہے کہ جب آپریشن ہو اور یہ بے ہوشی سے ہوش میں آئیں، تب ان کی پہلی نظر ایک نوزائیدہ بچے پر پڑے۔ وہ یہ سمجھیں کہ ماں بن گئی ہیں۔

اسی دن کیرتی کو بھی چکر آیا تھا اس کی بھی جانچ ہوئی تھی اور اسے پتہ چلا تھا کہ...... اور اسے یاد آ رہی تھی اب سے پانچ ماہ پہلے والی ساون کی وہ رات جب برسات کی جھڑی لگی تھی بجلی شام سے ہی غائب تھی بادل گرج رہے تھے، آدھی رات کا وقت تھا ایسے میں لاٹھی کے سہارے کھسکتا ہوا راگھو اس کے بستر پر چلا آیا تھا اور وہ اس کے پیار کے بہاؤ میں بہہ گئی تھی، اور اب دھرتی کے سینے میں ایک اور بیج پنپ رہا تھا۔ کیرتی کا بوجھ بڑھ گیا تھا اور میم صاحب تل تل موت کی کگار کی طرف بڑھتی جا رہی تھیں۔

بڑے صاحب نے اسی موضوع پر بات کرنے کے لیے خوب اچھی طرح سوچ سمجھ کر دوسرے دن اسے بلایا تھا۔ اس کے بدلے وہ اس کی ساری ذمہ داریاں اٹھانے کو تیار تھے۔ بچیوں کی پڑھائی لکھائی، شادی، پتی کا علاج مکان کی مرمت وغیرہ وغیرہ اسے اپنے گھر میں بات کرنی تھی ان لوگوں سے اجازت لینی تھی۔ تین چار مہینے کے لیے میم صاحب کے ساتھ بنگلور جانے کی۔ وہاں میم صاحب ہاسپٹل میں ایڈمٹ رہیں گی اور کیرتی ان کی دیکھ بھال کرے گی۔

بس ایک بات نہیں بتانی ہے امید سے ہونے کی بات......

ساری رات وہ سوچتی رہی۔ صبح اس کے سر میں تیز درد ہو رہا تھا۔ پھر بھی اپنا روزمرہ کا کام نمٹا کر باہر کی ڈیوٹی کرنے گھر سے نکل پڑی۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ صاحب سے ایک دن کی اور مہلت مانگ لے گی۔ اس بارے میں بات کرنے کے لیے۔

سارا دن وہ کام میں جٹی رہی۔ سر درد کی دوا اسے میم صاحب نے دے دی تھی اور خود بھی اس کے کام میں ہاتھ بٹایا تھا۔ کیرتی نے بار بار کہا۔ ”نہیں میم صاحب یہ سب آپ کے کرنے کا نہیں ہے۔ ہم کر لیں گے نا۔“

”مگر میم صاحب کچھ نہ کچھ کرتی رہیں۔ وہ اپنے اندر پل رہے ایک بھرم کی خوشی میں سرشار معلوم ہو رہی تھیں اور کیرتی نہیں چاہتی تھی کہ یہ بھرم ٹوٹ جائے۔ اس نے اپنی آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو چپکے سے اپنے آنچل میں جذب کر لیا۔

آج گھر پہنچنے میں اسے کچھ زیادہ ہی دیر ہو گئی تھی۔ صاحب نے اسے اپنی پہچان کے آٹو رکشہ میں بیٹھا دیا تھا۔

گھر پہنچتے ہی اسے عجیب سے سناٹے کا احساس ہوا۔ اس کا پتی دروازے کی طرف پیٹھ کیے چپ چاپ پڑا ہوا تھا۔ اندر کمرے میں رومی اور سومی ڈری سہمی بیٹھی ہوئی تھیں موتی کا بکس کھلا پڑا تھا۔ رسی پر پڑے اس کے کپڑے غائب تھے۔ چولہا ٹھنڈا پڑا تھا۔ مرغیاں آنگن میں جہاں تہاں بیٹھی کڑکڑا رہی تھیں۔

اسے آتا ہوا دیکھ کر رومی اور سومی دھیرے سے اُٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔ کیرتی آہستہ آہستہ چلتی ہوئی ان کے قریب آ گئی۔

'کیا ہوا بیٹا؟ یہ سب۔ یہ سب کیا ہے؟؟'

'ماں......وہ......دیدی......'

'کہاں ہے وہ......اور اس کا بکس۔ اس کے کپڑے؟'

'دیدی ماما کے یہاں چلی گئی ماں...... کہہ کر گئی...... کہ...... کہ'

'کیا کوئی اسے لینا آیا تھا؟'

'نہیں ماں۔ بات یہ ہے کہ آج پاپا نے اسے بہت ڈانٹا۔ کھانا پکنے میں تھوڑی دیر ہو گئی تھی اور پاپا نے تمھیں بھی بہت گالیاں دیں۔ بہت گندا گندا کہا۔ ماں تم ہر روز اتنی اتنی دیر کیوں کر دیتی ہو؟ کہاں جاتی ہو ماں؟ پاپا بہت بولتے ہیں تمھیں۔'

کیرتی نے اپنے آنچل سے ان کے آنسو پونچھے اور دھیمے سے بولی۔

'تمھارے لیے یہ سب سمجھنے کا وقت ابھی نہیں آیا بیٹا۔ جاؤ جا کر مرغیوں کو ڈربے میں بند کر دو۔ ہم ابھی آتے ہیں۔'

اپنے کمرے میں آ کر کیرتی نے کاغذ قلم اٹھایا اور کچھ لکھنے لگی۔

صبح منھ اندھیرے ہی وہ اپنے کمرے سے نکل آئی تھی اس کے چہرے پر سکون کے سائے لہرا رہے تھے اور وجود میں ایک عزم مصمم اور بائیں ہاتھ میں ایک ایئر بیگ۔ اس کا پتی بے خبر سو رہا تھا، ہاتھ میں پکڑا ایک سفید رنگ کا بند لفافہ اس نے پتی کے سرہانے رکھ دیا۔ دونوں بچیوں کو سینے سے لگا کر خوب پیار کیا اور بولی۔

'ہم چار پانچ مہینے کے لیے باہر جا رہے ہیں بیٹا۔ پر تم لوگ بالکل نہ گھبرانا پڑوس کی مندرا چاچی بہت اچھی ہیں وہ تمھارا خیال رکھیں گی اور ہم کو تمھاری خیر خبر پہنچاتی رہیں گی اور جب تمھارے پاپا کو چائے کی طلب لگے تو ان سے کہنا وہ خود بنا لیا کریں۔ وہ چاہیں تو اپنی روٹی بھی بنا سکتے ہیں۔ جس طرح ٹھسکتے ٹھسکتے ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں...... اسی طرح باورچی خانے میں......'

اور ہاں الماری کے لاکر میں ہم نے تمھارے لیے پورے دس ہزار روپے رکھ چھوڑے ہیں۔ تمھارے خرچ کے لیے۔

اور لاکر کی...... چابی مٹی کے چولہے کے پاس والی دیوار کے کھوکھے میں رکھی ہوئی ہے۔ انھیں سنبھال کر رکھنا۔'

آگے کی بات ابھی تمھاری سمجھ میں نہیں آئے گی۔ کل بڑی ہو کر جب تم عورت بنو گی تب سمجھ پاؤ گی زندگی کو، بھگوان اگر کہیں ہے تو وہ تمھاری حفاظت کرے گا ورنہ تمام انسانوں کو زندگی دینے والی عورت ہی ہوتی ہے!

کیرتی دروازے سے باہر جا چکی تھی۔ مندرا چاچی دونوں بچیوں کو اپنے آنچل میں سمیٹے دور جاتی ہوئی کیرتی کے قدموں کے نشان کو دیکھ رہی تھیں۔

جب راگھو سو کر اٹھا تو بہت دیر ہو چکی تھی سورج اپنی آدھی مسافت طے کر چکا تھا پورا گھر سونا پڑا تھا۔

رومی اور سومی کو آواز دینے ہی والا تھا کہ اس کی نظر لفافے پر جا پڑی۔ اس نے لفافہ اٹھا لیا۔

'یہ کیا ہے؟ یہ سوال شاید اس نے اپنے آپ سے ہی کیا ہوگا۔ کیونکہ اس کے آس پاس اور کوئی تھا ہی نہیں۔

ماتھے پر شکن چڑھائے چڑھائے اس نے لفافہ پھاڑ کر خط نکال لیا...... لکھا تھا......

راگھو سنگھ راٹھور

'سوچا تھا تم سے پوچھ کر جائیں گے۔ بتا دیں گے تمھیں سب کچھ پر اب اس کی ضرورت نہیں رہی۔

لوگ کہتے ہیں تم دیوتا ہو۔ تمھیں دیوتا کا درجہ ملا ہوا ہے۔ لیکن ہماری نظر میں تم محض ایک بے جان پتھر ہو۔ دوسروں کو چوٹ پہنچانے والے۔'

تم بھی پتھر ہو، تمھارا مندر بھی پتھر کا ہے۔ اور اب ہم ان پتھروں سے ٹکرا ٹکرا کر اپنا سر پھوڑنے کی بجائے کسی کو زندگی جینے کا حوصلہ دینا زیادہ بہتر سمجھتے ہیں۔

ہم جا رہے ہیں، تل تل کر موت کی کھائی کی طرف سرکتے جا رہے ایک جاندار کو زندگی کی ہریالی کی طرف لوٹانے کے لیے۔

ایک عورت ہی عورت کو زندگی دے سکتی ہے۔

اس سے آگے میرے بارے میں جاننے کا کوئی حق تمھیں نہیں رہا!!

شیش شبھ

کیرتی شرما

□□□

Mrs. Sheerin Niyazi
Teacher's Colony,
P.O. River Side Bhurkunda
Dist. Ramgarh-829135 (Jharkhand)

آسمان روتا کیوں ہے

ڈاکٹر حسام الدین فاروقی

ایک کاغذ کے چھوٹے سے حصے پر جانے کیوں میں نے لکھا کہ ’آسمان روتا کیوں ہے‘ اور پھر اس کاغذ سے دور کہیں اپنی خالہ کی آواز میرے کانوں میں گونجی۔

’یہ بات اس وقت کی ہے جب میں شام اپنے دفتر سے لوٹا تھا پہلے بارش کی پہلی بوندوں نے مجھے بھگو دیا تھا اور خالہ سے کہا’ خالہ یہ آسمان اتنا روتا کیوں ہے‘۔ اس سے پہلے کہ خالہ کچھ جواب دیتیں۔ بادل تیزی کے ساتھ کڑکے اور بارش کا تیز جھونکا اس طرح آواز کرنے لگا کہ خالہ نے شاید پانی کے زور شور میں جواب نہیں دینا ہی مناسب سمجھا اور وہ کمرہ چھوڑ کر چلی گئیں۔

میں بارش میں بھیگ چکا تھا۔ اب چائے کی خواہش ہو رہی تھی کہ تبھی خالہ نے آواز دی۔ پرویز...... برسات کا تیز پانی اب شاید دھیما ہو چکا تھا تبھی مجھے خالہ کی آواز سنائی پڑی۔ مجھے خوشی محسوس ہوئی کہ خالہ کی یہ دعوت چائے کے لیے تھی جسے اس وقت مجھے بہت ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔

میری چائے کی چسکیوں سے ملے سکون کے باوجود خالہ کی دھیمی سی مدھم آواز نے مجھے پھر ان کی طرف متوجہ کر دیا۔ وہ اپنی دھیمی اور مغموم آواز کے باوجود میری طرف دیکھ کر اپنے ہونٹوں کی مسکراہٹ کو چھپا نہیں پا رہی تھیں۔

میرا سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھنا فطری بات تھی خالہ میرے تجسس کو سمجھ چکی تھی۔ چائے کے پیالے آدھے خالی ہو چکے تھے تبھی خالہ نے کہا۔

’پرویز۔ امی تو تمہاری تبھی اللہ کی طرف بلا لی گئی تھیں جب تم محض ڈیڑھ سال کے ہو گے۔‘ اس سے تمہاری پرورش کا ذمہ میرے ذمے آ گیا۔ میں نے اپنی سکت اور استطاعت کے ساتھ تمھیں اسکول بھیجنا شروع کیا۔ لیکن مجھے یاد ہے کہ تم تب بھی کئی بار مجھ سے یہ سوال کرتے رہے کہ ’خالہ یہ آسمان روتا کیوں ہے‘ اور میں نے ہمیشہ ہی کسی نہ کسی طرح اس سوال کا جواب ٹال دیا۔

میں آخر کس طرح تمھیں سمجھاتی کہ دنیا بنانے والے نے تمہارے باپ کو پیار کیا۔ تمہاری ماں اور میری بہن ان کی خدمت میں اپنی لگی لگائی نوکری چھوڑ دی۔ اس کے باوجود بھی تمہارے والد کو نہ بچنا تھا نہ بچ سکے۔ وہ اللہ کو پیارے ہوئے تو تمہاری امی کو جان لیوا بیماری کا پتہ لگا۔ تمہاری پیدائش کے ساتھ ہی تمہاری امی اپنی بیماری اور تمہاری پرورش میں اپنا بچا کچھا سرمایہ بھی کھو چکی تھیں۔ ہم لوگوں سے جتنا بنا ہم نے کیا۔ لیکن قدرت نے آپا، تمہاری ماں کو بھی ہم سے جدا کر دیا۔ میں اپنی تنہائی کے درد کو سمجھ سکتی تھی۔ تنہائی کے درد کو سہہ سکتی تھی۔ لیکن بچپن میں تمہاری معصومیت سے کہاں سمجھ پاتی تھی۔

تم اس ہی بات کو کس طرح سمجھ سکتے تھے کہ تمہارے خالو کے جانے کے بعد میرے لیے تم ہی سب کچھ تھے۔ اس لیے مجھ سے جتنا ہو سکا تم کو لکھانے پڑھانے کے لیے اپنی محنت جاری رکھی۔ کپڑے سیے، بچوں کو قرآن شریف پڑھایا اور یہ چاہا کہ تمہارے سر پر کوئی غم یا بوجھ نہ رہے۔ لیکن قدرت بھی خوب ہے۔ انسان کے سینے میں غائبانہ جذبات اسی طرح پیدا کرتی ہے جس طرح ہم کو خود بہ خود بھوک لگنے کا احساس ہونے لگتا ہے۔ اسکول سے آنے کے بعد بارش کے دنوں میں برسات کو تم نے ہمیشہ آسمان کے رونے سے تشبیہ دی اور تمہاری اس نادانی پر یا یوں کہوں کہ اس سمجھداری پر ہمیشہ حیرت ہی کرتی رہی کہ آخر تم بارش کو اس طرح آسمان سے گرتے ظلم و ستم سے کیوں اور کس طرح تشبیہ دیتے ہو؟

میں نے کئی بار سمجھانا چاہا کہ اسی بارش سے زمین پھر گیلی ہوتی ہے نئے پودے نئی کونپلوں کے ساتھ پھر لہلہاتے ہیں۔ کھیت کھلیان ہرے ہو جاتے ہیں۔ انسانوں کے پیٹ کی بھوک کا ازالہ بھی اسی بارش کے سبب ہوتا ہے۔ لیکن یہ سب میں صرف اپنے خیالوں میں سوچ کر ہی رہ جاتی۔

تم بڑے ہوئے تمہاری تعلیم کی حصولی کے سبب ہم لوگ دور ہو گئے اور دور بھی رہے۔ لیکن آج اتنے سال کے بعد تمہارے سوال نے پھر مجھے چونکا دیا۔ آج بھی میں تمھیں تمہارے سوال کا کوئی اطمینان بخش جواب نہیں دے سکتی کہ............ خالہ......

’آسمان روتا کیوں ہے‘

Dr. Hisamuddin Faruqui
Indu 32, Chinar Fortline City
Hoshangabad Road
Bhopal-462026 (M.P)

چاند گرہن

عشرت ناہید

چندا سے میری ملاقات سر راہ ہی ہوئی تھی دراصل میرا گھر میں سڑک سے تقریباً ایک کلومیٹر اندر تھا جہاں سے صبح کے وقت بہت سی خواتین اور کالج جانے والی لڑکیاں نکلتی تھیں ان میں سے زیادہ تر پیدل ہی سڑک تک جا کر رکشا یا بس سے اپنی منزل پر پہنچتی تھیں ۔گرمی کے موسم میں یہ دوری بہت مشکل لگتی تھی اس کا اندازہ مجھے ان کی چال اور چہرے پر آئے پسینے کی بوندوں سے ہوتا تھا خیر یہ ان خواتین اور لڑکیوں کا معمول تھا۔

میرا بھی یہی معمول تھا جیسے ہی گھر سے گاڑی اسٹارٹ کرتی نظریں ادھر ادھر کچھ تلاش کرنا شروع کر دیتیں۔ جیسے ہی کوئی خاتون جس کے کاندھے پر پرس ہوتا یا کوئی لڑکی کتابوں کا بیگ لے جاتی نظر آتی میں اس کے نزدیک جا کر ہارن بجا کر گاڑی روکتی اور اس سے پوچھتی

’’کیا اسٹاپ تک جاؤ گی؟‘‘

وہ ہاں کہتی تو میں فوراً گاڑی کا دروازہ کھول کر بیٹھنے کے لیے کہتی اور پھر اسٹاپ پر انھیں اتار کر اپنے آفس چلی جاتی۔

خواتین اکثر مسکراتے ہوئے بیٹھ جاتیں مگر لڑکیاں تھوڑا پس و پیش کرتیں کہ زمانہ خراب ہے پتہ نہیں یہ گاڑی والی آنٹی کہاں لے جائیں لیکن زیادہ تر لڑکیاں دو لمحے کے لیے سوچتیں پھر دھوپ دیکھ کر بیٹھ جاتیں لیکن بیٹھتے ہی یہ ضرور پوچھتیں

’’آنٹی آپ کہاں جاب کرتی ہیں؟‘‘

’’کہاں رہتی ہیں؟‘‘

مجھے ان کی یہ احتیاط اچھی لگتی ۔مگر کسی دن ایسا بھی ہوتا کہ کوئی لڑکی میری پیش کش ٹھکرا دیتی میں مسکراتی ہوئی آگے تو بڑھ جاتی مگر دل میں قلق ہوتا کہ کاش یہ لڑکی اس چھوٹے سے راستے پر میری ہمسفر بن جاتی جس سے یہ مختصر سا راستہ میرے لیے نیکی کا سبب بن جاتا۔ دراصل میں جب چھوٹی تھی تب امی سمجھایا کرتی تھیں کہ بیٹا کسی کی کوئی بڑی مدد کرنا بہت اچھی بات ہے مگر چھوٹی چھوٹی مدد ہمارے لیے بہت آسان ہوتی ہے اور اطمینان قلب کا باعث بھی ۔امی کی یہ بات کچھ اس طرح ذہن میں بیٹھی تھی کہ کب عادت بن گئی پتہ ہی نہ چلا۔ جب کہ میرے شوہر میری اس عادت پر ہنستے بھی تھے اور ڈراتے بھی تھے کہ یہ بڑا شہر ہے دن رات حادثے ہوتے ہی رہتے ہیں کسی دن کسی خاتون نے گاڑی میں بیٹھ کر تم پر ہی پستول تان کر لوٹ لیا تا تب سمجھ میں آئے گا۔

ہاں تو میں یہ بتا رہی تھی کہ چندا سے بھی میری ملاقات اسی طرح ہوئی تھی۔ چندا 25 /26 سال کی چاند جیسی من موہنی صورت والی لڑکی تھی۔ چندا کے ہالے جیسا ہی گول چہرہ بڑی بڑی آنکھیں جنھیں وہ کاجل

کی ہلکی سی لائن سے سجائے رکھتی پتلے پتلے گلابی ہونٹ جس کے نیچے دائیں طرف باریک سا سیاہ تل بہت پیارا لگتا۔ جب وہ بات کرتی تو بہتے جھرنے کی سی مدھر آواز کانوں میں جھنکار گھولتی، جب ہنسنے کے لیے اس کے لب وا ہوتے تو اس کے گالوں میں ہلکے سے گڑھے پڑ جاتے جو اس کی خوبصورتی کو کچھ ایسا بڑھا دیتے کہ دیکھنے والا اسے ایک ٹک دیکھتا ہی رہ جائے۔ میں اسے دیکھ کر سوچتی کہ سب کہتے ہیں کہ چاند میں داغ ہوتا ہے مگر اوپر والے نے اسے کتنا بے داغ بنایا ہے لگتا ہے ساری فیاضی اسی کو بنانے میں صرف کردی کوئی کمی نہ چھوڑی۔ اس پر اس کا مزاج ساری شگفتگی بھی جیسے اسی میں سمادی تھی۔ وہ بہت ہی خوش مزاج اور خوش مذاق تھی۔

دراصل چندا کے اور میرے جانے کا وقت ایک ہی تھا اس کا گھر میرے گھر سے بھی آگے کہیں تھا۔ وہ انٹیریئر ڈیکوریٹر تھی اور کسی انٹیریئر کی شاپ پر کام کرتی تھی۔ وہ اکثر مجھے مل جایا کرتی تھی میں نے اس سے کئی مرتبہ کہا کہ اگر تم گھر کے باہر گاڑی کھڑی دیکھو تو رک جایا کرو یا بیل بجادیا کرو لیکن اس نے کبھی ایسا کیا نہیں۔

آہستہ آہستہ اس کی اور میری دوستی ہوتی گئی۔ وہ جب بھی ساتھ ہوتی تو اس کا دھیمہ لہجہ بات کہنے کا لطیف انداز ایسا لگتا مانو چاند اپنی ٹھنڈی ٹھنڈی چاندنی سے نور کی کرنیں بکھیر کر ماحول کو خوشنما بنا رہا ہے اور وہ پانچ منٹ کا راستہ کچھ ایسا تاثر مجھ پر چھوڑتا کہ سارا دن ہی خوشگوار گزرتا۔ لیکن ایسا روز نہیں ہوتا تھا کیونکہ میرا آفس ہفتہ میں پانچ دن اس میں بھی کبھی کبھی وہ نہیں ملتی تھی اس لیے مجھے اتنے دنوں میں اس کی ذاتی زندگی کا کچھ علم نہیں ہو پایا تھا ایک دن میں نے اس سے پوچھ ہی لیا کہ

''چندا تمھارے گھر میں کون کون ہے؟''

کہنے لگی ''ساس شوہر اور دو بچے ایک بیٹا اور ایک بیٹی۔''

''بچے کتنے بڑے ہیں؟''

''بیٹا او جس ساتویں جماعت میں اور بیٹی سونیا پانچویں جماعت میں۔''

''تو تم لوگوں کی غیر حاضری میں ساس بچوں کو دیکھ لیتی ہوں گی؟''

وہ صرف اپنے ہی بیٹے کو دیکھتی ہیں اس نے ہنستے ہوئے کہا لیکن اس کی ہنسی میں وہ کھنک نہیں تھی جو روز ہوا کرتی تھی میرے بچے تو ایک دوسرے کو خود ہی سنبھال لیتے ہیں۔''

مجھے اس کا جواب عجیب سا لگا پھر خیال آیا کہ ہمارے یہاں مائیں شادی کے بعد بھی بیٹوں پر پوری گرفت رکھتی ہیں کہ کہیں بہو اسے اپنے قبضے میں نہ کر لے ایسا ہی کچھ معاملہ ہوگا۔

میں تو اس بات پر حیران تھی کہ چندا کے اتنے بڑے بچے ہیں مطلب اس کی شادی بہت کم عمر میں ہی ہوگئی ہوگی۔

''چندا تمھاری شادی کب ہوگئی تھی؟''

''میری شادی تو اس وقت ہی ہوگئی تھی جب مجھے سہانے سپنے پوری طرح سمجھ میں بھی نہیں آتے تھے اور نہ ہی شادی کے مفہوم سے پوری واقفیت تھی۔ دراصل میں گیارہویں جماعت پاس کر کے بارہویں جماعت میں پہنچی ہی تھی کہ یہاں سے رشتہ آگیا۔ لڑکا بہت خوبصورت اور بقول میری ساس کے کسی پرائیوٹ کمپنی میں آفیسر تھا۔ میرے پاپا نے شادی طے کردی اور جیسے ہی میرے امتحان ختم ہوئے شادی ہوگئی۔''

اسٹاپ آگیا تھا وہ شکریہ ادا کرتی ہوئی اتر گئی۔

پھر جب راکھی آئی تب اس نے بتایا کہ اس کا ایک چھوٹا بھائی ہے جسے وہ بہت پیار کرتی ہے لیکن بچوں کے ٹیسٹ کی وجہ سے وہ مائکے جا نہیں پا رہی تب میں نے اس سے یونہی پوچھ لیا تھا کہ

''تمھارے پاپا کیا کرتے ہیں؟''

وہ کہنے لگی:

''پاپا نہیں ہیں وہ تو اسی وقت دنیا سے چلے گئے جب شادی کے بعد پہلی بار میں ان سے ملنے گئی۔ انھیں دل کا شدید دورہ پڑا تھا جو کہ جان لیوا ثابت ہوا۔ لیکن میرے پاپا کے بعد میرے سسر نے مجھے بیٹی کا سا پیار دیا تھا مگر وہ بھی جلدی چلے گئے۔''

یہ باتیں کرتے ہوئے اس کا گلا رُندھ گیا تھا اور وہ بہت اداس ہوگئی مجھے پہلی بار اس کی آواز میں نمی کا احساس ہوا تھا جس کا مجھے بہت ملال بھی ہوا کہ میں نے کیوں اس سے ایسی بات کی۔ اس کی آنکھوں کی نمی میرے دل کے پار اتر گئی تھی اور اسی وقت میں نے طے کرلیا کہ آئندہ اس سے کبھی ذاتی زندگی کی بات نہیں کروں گی کیونکہ مجھے چندا کی ہنستی ہوئی چاندنی پسند تھی اس پر کسی بادل کا سایہ نہیں۔

پھر ہمارے درمیان ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ وہ بھی کبھی کوئی گھر کی بات نہیں کرتی تھی بس پھر وہی معمول تھا ہمارا۔ وہ مل جاتی راستہ خوشگوار سا کٹ جاتا میرا دن اچھا گزر جاتا۔ واپسی میں وہ مجھے کبھی نہیں ملتی کیونکہ وہ بہت دیر سے لوٹتی تھی۔ تقریباً آٹھ بج جاتے تھے صبح دس بجے سے شام ۷ بجے تک کی سخت ڈیوٹی تھی اس کی۔ گھر پہنچ کر وہ بچوں کو ہوم ورک کرواتی پھر اس کے بعد کھانا ایک بار میں نے اس سے کہا کہ

''چندا تم کتنا تھک جاتی ہوگی اتنی لمبی ڈیوٹی سے۔''

اس کا جواب تھا ''ڈیڈی بچوں کو دیکھتے ہی ساری تھکن کہاں غائب ہو جاتی ہے پتہ ہی نہیں چلتا۔''

اگلے مہینے دیوالی تھی وہ بہت خوش تھی اور گھر کو سجانے کی تیاری بڑے زور و شور سے کر رہی تھی۔

دیوالی سے پہلے جب کرواچوتھ کا ورت آیا یہ ورت عموماً شادی شدہ خواتین اپنے شوہر کی درازئی عمر اور اگلے جنم میں اسی کے ساتھ کی تمنا میں رکھتی ہیں تو اس دن چندا نے بھی ورت رکھا تھا میں نے اسے چھیڑتے ہوئے کہا۔

'' آج تو چندا اپنے چاند کے درشن کر کے ہی ورت کھولے گی اور اس کی چاندنی میں نہائے گی۔''

''نہیں میں تو زمینی چاند کو نہیں حقیقی چاند کو ہی دیکھ کر ورت کھولوں گی کیونکہ وہ میرے ہی جیسا لگتا ہے اور وہی میرا سچا ساتھی ہے۔''

'' ارے کیسی باتیں کر رہی ہو زمین کے چاند نے تو تمھارے آنچل میں کتنے پیارے پیارے ستارے ٹانکے ہیں اس کا شکریہ ادا نہیں کرو گی عجیب بے مروت لڑکی ہو جی تم تو۔''

میں نے ہنستے ہوئے کہا

''ہاں آنچل تو سجایا ہے۔''

''میری تو یہی دعا ہے کہ تمھارے ہر جیون کو یہی چاند روشنی دیتا رہے۔''

اس نے اپنی ہتھیلی میرے ہونٹوں پر رکھ دی اور ہنس کر کہنے لگی

''بس یہی جیون کافی ہے اب ایسی کوئی دعا نہ دینا۔''

میں نے اس کی اس حرکت کو مذاق ہی جانا اور مسکرا دی

وہ گنگنانے لگی تھی۔

''چندا رے چندا رے کبھی تو زمیں پہ آ بیٹھیں گے باتیں کریں گے۔''

میں گیت اور اس کی آواز کے سحر میں کھوتی کہ اسٹاپ آ گیا اور وہ چلی گئی۔

چندا کی باتیں کبھی کبھی مجھے بڑا حیران کر دیتی تھیں اور میں سوچ میں پڑ جاتی کہ یہ لڑکی کیا ہے اس کی سوچ میں اتنی گہرائی کہاں سے آ جاتی ہے۔ لیکن ایسا بھی لگتا کہ شاید میں غلط سوچ رہی ہوں کیونکہ ہمارے ملنے کا دورانیہ بہت ہی کم ہوتا تھا۔ پانچ منٹ سے بھی کم وہ بھی روز نہیں اس وجہ سے کسی بھی موضوع پر گفتگو ٹھیک سے ہو اس سے پہلے اسٹاپ آ جاتا اور بات ادھوری رہ جاتی۔

ایک دن میں نے اس سے کہا

'' چندا تمھارا نام مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ دل چاہتا ہے اپنی بیٹی کا نام بدل دوں اور چندا رکھ دوں۔''

وہ ایک دم تڑپ کر بولی

'' نا دیدی ایسا کبھی نہ کرنا آپ کو پتہ نہیں کیا کہ چاند کتنی اجاڑ جگہ کا نام ہے جہاں نہ ہوا ہے نہ پانی بس ایک حبس کا عالم ہے ایک گھٹن ہے اور یہ بھی کہ چاند کو گرہن بھی لگا کرتا ہے اور اس گرہن کی تکلیف کے بعد بھی اسے اپنے محور سے نجات نہیں اسے اپنے مدار پر گھومتے ہی رہنا ہوتا ہے۔''

''ہائیں کیسی فلسفیانہ باتیں کرنے لگیں تم'' میں نے شدید حیرانی کے عالم میں پوچھا۔

آج میں پہلی مرتبہ اس کی زبان سے اتنی منفی باتیں سن رہی تھی وہ بہت زندہ دل لڑکی تھی اور اس کی سوچ ہمیشہ مثبت رہی تھی۔

''ارے بابا مجھے تو چاند کی روشنی سے عشق ہے دیکھو نا کیسی ٹھنڈی ٹھنڈی روشنی سے کائنات کو منور کرتا اندھیرے کو اجالے میں بدل دیتا۔ اس کی خوبیاں دیکھو۔''

''لیکن خود تو ویران ہے نا۔''

آفس پہنچنے تک اس کی باتیں میرے دماغ میں گھومتی رہیں۔

پھر دیوالی کی وجہ سے وہ اور جلدی گھر سے نکلنے لگی تھی اس لیے اس سے ملاقات کا سلسلہ رک سا گیا تھا لیکن دیوالی پر اس نے مجھے فون پر گھر آنے کی پر زور دعوت ضرور دی۔

میں نے بھی وعدہ کر لیا تھا اور اس سے کہا کہ راستہ بتا دینا کس طرف آنا ہے کہنے لگی ''میں لینے آ جاؤں گی۔ آپ آٹھ بجے تیار رہیے گا۔''

مقررہ وقت پر وہ آ گئی تھی۔

آج چندا بالکل چودھویں کے چاند کی طرح جگمگا رہی تھی۔ اس نے ہلکے نیلے رنگ کی بڑی خوبصورت ساڑی پہنی تھی۔ اسی کی ہم رنگ ڈھیر ساری چوڑیاں جن کے بیچ بیچ میں نگینے جڑے تھے۔ طلائی کڑے تھے جو اس کے ہاتھوں کی ہلکی سی بھی حرکت پر جھلملا اٹھتے تھے انگلیوں میں انگوٹھیاں، گلے میں نازک سا گلوبند، کانوں میں جھمکیاں پھر اس سب پر اس کا سلیقے سے کیا گیا میک اپ اس کو کچھ ایسا حسین بنا رہا تھا کہ حقیقی چاند بھی شرما جائے۔

بچے اور میں تیار تو تھے ہی اس کے آتے ہی فوراً نیچے اتر گئے۔ وہ کہنے لگی

''دیدی گاڑی سے ہی چلیے بچے اتنا نہیں چل پائیں گے۔''

میں گاڑی کی چابی لے آئی اور ہم لوگ چل پڑے گلی تنگ ہونے اور اس میں بھی بچوں کے پٹاخے پھوڑنے کی وجہ سے گاڑی دھیمی رفتار سے چل رہی تھی جس طرح آہستہ روی سے زندگی چلتی ہے۔ وہ بچوں سے اپنے مخصوص انداز میں ہنستی مسکراتی باتیں کرتی رہی بیچ بیچ میں راستہ بھی بتاتی رہی۔ ایک کالے رنگ کے گیٹ پر اس نے رکنے کے لیے کہا اس کا گھر تو کافی دور تھا یہ اتنی دور سے پیدل جاتی ہے میں سوچ رہی تھی۔

اس کا گھر باہر سے بڑا ہی خوبصورت چھوٹے سے بنگلے نما تھا جس کی منڈیر پر ایک قطار میں دیئے جل رہے تھے مین گیٹ کے اندر زمین پر قوس قزاحی رنگوں سے سجی دلفریب رنگولی تھی اور اس کے درمیان میں ایک بڑا سا دیا جگمگا رہا تھا جو مجھ سے کہہ رہا تھا کہ یہاں زندگی بہت روشن اور رنگوں بھری ہے۔ ڈرائنگ روم کی سجاوٹ بھی چندا کے سلیقے کی منہ بولتی تصویر تھی۔ ہم جیسے ہی اندر پہنچے اس کے دونوں بچوں نے نمستے کرتے ہوئے آگے بڑھ کر میرے پیر چھوئے اور دیوالی کی مبارکباد دی۔ میں نے انھیں گلے سے لگا کر تحفے دیے، وہ میرے بچوں کو لے کر اندر کھیلنے چلے گئے میں اور چندا بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ اسی دوران اس کی ساس بھی آگئیں تقریباً60 / 65 سال کی باوقاری خاتون تھیں۔ میں نے انھیں دیوالی کی مبارکباد دی انھوں نے بھی مجھے گلے لگا کر دعائیں دیں۔ چندا اندر چلی گئی تھی اس کی ساس کہنے لگیں۔

''میری بہو بہت محنتی ہے لیکن اسے سارا دن ہو جاتا ہے میں تو اس سے کہتی ہوں کہ یہ نوکری چھوڑ کر کہیں اور کوشش کرے جہاں سے پانچ بجے واپس آ کر گھر دیکھ سکے۔''

''آج کل سروس آسانی سے کہاں ملتی ہے۔'' میں نے کہا

''کوشش کرے انسان تو سب مل جاتا ہے۔''

وہ چندا سے شاکی سی تھیں اور ان کا لہجہ روایتی ساس کی طرح تھا جنھیں بہو کے ہر عمل سے شکایت ہوتی ہے۔

مجھے چندا کی بات یاد آئی جب اس نے بتایا تھا کہ سسر کے انتقال کے بعد ہی وہ سروس کرنے پر مجبور ہوئی۔ تب ہی چندا مٹھائیاں اور دیگر لوازمات سے بھری ٹرے لے کر آگئی۔ وہ بچوں کو بھی بلا لائی مگر وہ مٹھائی لے کر دوبارہ اندر چلے گئے اور چندا چائے بنانے۔ تب ہی ایک بہت خوبصورت سا نوجوان اندر آیا جسے دیکھ کر میں سمجھ گئی کہ یہ چندا کا شوہر ہے۔ میں اسے ایک ٹک دیکھتی ہی رہ گئی۔ وہ مردانہ وجاہتوں کا مکمل نمونہ تھا دراز قد، گوری رنگت، گھنگھرالے بال، چوڑی پیشانی، بہترین لباس جو اس کے اعلیٰ ذوق کا مظہر تھا۔ مجھے چندا کی قسمت پر رشک آنے لگا۔

وہ مسکراتا ہوا میرے بالکل قریب آ کر بیٹھ گیا۔ اس کی اس بے تکلفی پر میں اندر ہی اندر جز بز ہوئی اور تھوڑا سا دور سرک گئی۔ وہ بھی اور کھسک کر قریب ہو گیا تو میں نے اس کی ساس کی طرف دیکھا۔ وہ اس سے میرا تعارف کراتے ہوئے بولیں ''یہ میرا بیٹا اویناش ہے''۔ کہتے ہوئے ان کے چہرے پر تشویش کے آثار تھے جس سے میں پریشان سی ہونے لگی اویناش نے مسکراتے ہوئے میری طرف ہاتھ بڑھایا تب ہی آنٹی نے کہا۔

''بیٹا تم میرے پاس آجاؤ۔''

میں وہاں سے اٹھ کر ان کے ساتھ والے صوفے پر بیٹھ گئی۔ وہ میرے سامنے تھا اور مجھے گھور رہا تھا۔ مجھے اس سے ڈر سا لگنے لگا میں اٹھ کھڑی ہوئی۔

''آنٹی اب میں چلوں گی'' کہنے کے ساتھ ہی بچوں کو آواز بھی دے دی۔ بچے باہر آئے تو ان کے ساتھ چندا کے بچے بھی تھے۔ آتے ہی ان کی نظر اپنے پاپا پر پڑی پھر انھوں نے میری طرف دیکھا بچوں کی نظروں میں شرمندگی سی تھی مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ ماجرہ کیا ہے۔ سونیا نے کہا۔

''چلیے پاپا اندر چلتے ہیں۔'' اس میں کوئی حرکت نہیں ہوئی نہ ہی وہ سونیا کی طرف متوجہ ہوا وہ تو دھیمی آواز میں نہ جانے کیا کہہ رہا تھا۔ ہاتھ ہلا رہا تھا، عجیب عجیب شکلیں بنا رہا تھا، ہم باہر نکل آئے۔

چندا بھی گیٹ پر آ گئی تھی جس وقت وہ مجھے الوداع کہہ رہی تھی اس کے دھنک رنگ چہرے پر گرہن کے سائے واضح نظر آ رہے تھے۔

□□□

Dr. Ishrat Naheed

Asst. Professor

Maulana Azad National Urdu University,

Lucknow Campus

504/122 Taigore Marg,

Near Shabab Market

Lucknow-226020 (U.P.)

ڈاکٹر قدسیہ نصیر

مٹّی کی خوشبو

میں جب بھی صائمہ خالہ کے گھر جاتی خالو جان باہر والے کمرے میں گم صم بیٹھے نظر آتے۔ میں سلام کرتی تو ذرا سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیتے۔ کبھی کبھی میری خیریت بھی پوچھ لیتے۔ کبھی میں پوچھتی کہ خالو آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟ جواب میں پھر وہی بے کیف مسکراہٹ۔ مجھے کیا ہوا ہے بیٹا! میں ٹھیک ہوں۔ نہ جانے کیوں مجھے لگتا کہ وہ اندر ہی اندر گھل رہے ہیں۔ حالانکہ بظاہر انھیں کوئی تکلیف نہ تھی۔ آرام و آسائش کے تمام اسباب موجود تھے۔ روپے پیسوں کی تنگی بھی نہیں تھی۔ تینوں بیٹیوں کی شادی کر چکے تھے۔ اور ماشاء اللہ تینوں بیٹیاں اپنے اپنے گھروں میں خوش تھیں اور آرام و سکون کی زندگی بسر کر رہی تھیں۔ تینوں بیٹے بھی ماشاء اللہ برسرِ روزگار تھے۔ اگرچہ سرکاری ملازمت نہ تھی لیکن پرائیویٹ سیکٹر میں اچھے عہدوں پر تھے۔ تینوں کی اچھی سیلری تھی۔ دو بیٹے شادی شدہ تھے۔ بس ایک چھوٹے صاحبزادے آفتاب میاں کی شادی باقی تھی۔ سیکڑوں رشتے آ رہے تھے۔ طے تھا کہ سال کے اندر اندر ان کی شادی ہو جائے۔ مجموعی طور پر خوشحال گھرانہ۔ بس خالو خوش نظر نہیں آتے۔ یہ اندازہ تو سبھی کو تھا کہ شہر کی زندگی انھیں راس نہ آئے گی۔ لیکن دقت یہ تھی کہ گاؤں میں اب ان کی دیکھ بھال کون کرے گا؟ اور گاؤں میں اب بچا بھی کیا تھا؟ خالہ جان شہر میں بیٹوں کے ساتھ بہت خوش تھیں۔ بیٹیاں بھی دبئی اور لندن سے چھٹیوں میں اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ آتیں تو شہر میں ہی رہتیں۔ پھر شہر سے ہی دبئی لندن واپس۔ بڑے داماد تو ائیر پورٹ سے گھر آتے اور پھر واپس ائیر پورٹ ہی جاتے۔ انھیں ٹرین کے سفر سے وحشت ہوتی۔ پندرہ سال سے گاؤں نہیں گئے تھے۔ پندرہ برس پہلے پے در پے دو مہینے کے اندر ان کی والدہ اور والد چل بسے تھے۔ اس کے بعد وہ پلٹ کے گاؤں نہیں گئے۔ کبھی گاؤں کا ذکر بھی نہیں کرتے۔ قریب کی مسجد میں نماز پڑھ آتے اور باقی وقت ٹی وی پر کرکٹ میچ دیکھتے یا ریڈیو پر اردو پروگرام سنتے۔ کرکٹ میچ کے ایسے دیوانے کہ ٹیسٹ میچ ہو، ون ڈے ہو یا ٹوینٹی ٹوینٹی، ہر میچ دیکھتے اور ریڈیو پروگرام سننے کے ایسے دیوانے کہ ریڈیو سیٹ ہمیشہ اپنے پاس رکھتے۔ اکثر بچوں سے کہتے کہ اچھی زبان اور تلفظ کی صحیح ادائیگی کے لیے ریڈیو پر اردو پروگرام سنا کرو۔ خود نفیس اردو بولتے اور غلط تلفظ پہ ٹوک دیتے۔ لیکن خالو جان سے ان کی کچھ خاص بنتی نہیں تھی۔ خالو جان کو اس بات پہ بڑی حیرانی تھی کہ یہ آدمی پندرہ برسوں سے اپنے گاؤں نہیں گیا ہے، پھر بھی خوش رہتا ہے؟ اور ستم یہ کہ گاؤں کو کبھی یاد بھی نہیں کرتا۔ بڑے داماد ہونے کا لحاظ کر کے خالو جان خاموش رہتے، مگر دبی زبان میں خالہ سے کہا کرتے کہ ”اکرم میاں بچوں کی طرح کرکٹ میں کھوئے رہتے ہیں۔ کبھی اپنے گاؤں گھر کو یاد نہیں کرتے۔ گاؤں کی مٹی کی خوشبو بھول گئے۔ بڑوں کے ساتھ بیٹھتے نہیں، باتیں نہیں کرتے، عجیب آدمی ہیں“۔ خالہ اکثر بڑے داماد کے بچاؤ میں اُتر آتیں۔

’ارے بھئی گاؤں میں اب اپنا ہے کون جس کے لیے مارے مارے پھریں۔ لندن میں نوکری کرتے ہیں۔ اچھے عہدے پر ہیں۔ صوم و صلوٰۃ کے پابند ہیں۔ اِدھر اُدھر بیٹھ کے اِن کی اُن کی چغلی کرنے سے تو بہتر ہے آدمی ٹی وی پر کرکٹ میچ دیکھ لیا کرے۔‘

خالو لاجواب ہو جاتے اور حسرت بھری نظروں سے خالہ کو دیکھتے ہوئے اُلٹے پاؤں اپنے باہر والے کمرے میں چلے جاتے۔ خالہ حسبِ معمول اردو ڈائجسٹ کے اسی صفحے سے اپنی کہانی شروع کرتیں جہاں تک پڑھ چکی ہوتیں۔ وقت سے نمازیں ادا کرنا، صبح کو قرآن پاک کی تلاوت پھر اخبار اور میگزین پڑھنا اور ٹی وی پہ سیریل دیکھنا خالہ کے محبوب مشغلے تھے۔ ان کے شب و روز سکون سے گزر رہے تھے۔ انھیں نہ بیٹوں سے شکایت تھی نہ بہوؤں سے اور بیٹی داماد سے تو خیر شکایت ہی کیا ہوتی۔ بڑے داماد اکرم میاں لندن میں مقیم تھے۔ باقی دونوں داماد بیوی بچوں کے ساتھ دبئی میں تھے۔ سال میں کم از کم وطن کا ایک چکر لگا جاتے۔ ہاں باقی دونوں داماد اکرم علی سے ان معنوں میں جدا تھے کہ وہ جب بھی ہندوستان آتے بیوی بچوں کو نانا نانی کے پاس شہر میں چھوڑتے اور دو چار دن کے لیے گاؤں ضرور جاتے۔ تمام رشتہ داروں سے مل ملا کے آجاتے۔ گاؤں سے واپسی پر کبھی گڑ تو کبھی دیسی گھی لاتے اور بڑے شوق سے اپنے ساتھ دبئی لے جاتے۔ خالو جان کو ان دونوں کی یہ ادا بہت پسند تھی۔ اکثر کہتے یہ ڈار سے بچھڑے پرندے ضرور ہیں لیکن بے جڑ کے پودے نہیں ہیں۔ یہ اپنی جڑوں سے پوری طرح کٹے نہیں ہیں۔ انھیں اپنی مٹی کا مول معلوم ہے۔

خالو جان اکثر اپنے تینوں بیٹوں کو سمجھاتے کہ بیٹا کبھی کبھی موقع نکال کے باپ دادا کی زمین دیکھ آیا کرو۔ دادا دادی کی قبر پہ فاتحہ پڑھ آیا کرو۔ بیٹے ان کی باتوں کو غور سے سنتے۔ حامی بھی بھرتے اور پھر اپنی اپنی زندگی میں مصروف ہو جاتے۔ تینوں فرماں بردار بیٹے اپنے والد کا خیال رکھتے۔ کبھی پلٹ کے ان کو کسی بات کا جواب نہیں دیتے۔ لیکن سچائی یہ تھی کہ انھیں اب اپنے گاؤں اور گاؤں کی زندگی سے کچھ خاص لینا دینا نہ تھا۔ گاؤں، کھیت، کھلیان، باغ، بغیچے کا ذکر وہ بار بار اپنے ابا کی زبانی سنتے لیکن ان کے لیے ان لفظوں میں کوئی کشش نہ تھی۔ اور یہی بات خالو کو پریشان کرتی کہ ان کے بچے مٹی کی خوشبو سے نا آشنا ہیں۔ وہ یہ بھی محسوس کرتے کہ ان کے بیٹے ان کی باتیں سنتے تو ہیں مگر امرود کے باغوں کا ذکر سن کے ان کی آنکھوں میں چمک پیدا نہیں ہوتی۔ وہ گاؤں کے پورب والے بڑے تالاب کا ذکر کرتے اور بڑا بیٹا اپنے اسمارٹ فون میں گوگل سرچ پہ جا کے کسی تالاب کی تصویر انھیں دکھا دیتا۔ خالو بڑی مشکل سے لہجے پر قابو رکھتے ہوئے کہتے:

''ارے بھئی یہ وہ تالاب نہیں ہے۔ اُس تالاب کے کنارے آم کے دو بڑے درخت تھے۔ وہ قلمی نہیں، دیسی آم کے درخت تھے۔ کچے آم جس قدر کھٹے ہوتے، پک جانے پر اتنے ہی میٹھے۔ ایک ایک درخت پر کئی کُنٹل آم پھلتے۔ اپنے بچپن میں ہم صبح سویرے، فجر کی نماز کے فوراً بعد اسی تالاب والے درختوں کے نیچے پہنچ کر ٹپکے ہوئے آم چنتے۔ انھیں ''ٹپکا'' کہا جاتا تھا۔ کیا میٹھے رسیلے آم تھے۔''

خالو اکثر ایسی باتیں کرتے۔ وہ اپنے کمرے میں بیٹھے بیٹھے گاؤں کے تالاب پہ پہنچ جاتے۔ کبھی نیم کے پیڑ کے نیچے کھڑے ہو کر جناتی مسجد کی میناروں کو تکتے۔ کبھی گاؤں کے اُتر کالی مائی کے استھان سے آگے گنے کے کھیتوں میں پہنچ جاتے۔ اپنے بچپن کے دوست رام بلاس کاکا کے آم کے باغوں سے ہوتے ہوئے نہر کی سیر کر آتے۔ دسترخوان پہ بیٹھے بیٹھے کہیں کھو جاتے۔ خالہ مسکرا کے کہتیں:

''تالاب پہ پہنچ گئے ہیں کیا؟''

سبھی ہنس دیتے۔ خالو جھینپتے ہوئے کہتے نہیں بھئی نہیں، بس یوں ہی ذرا سوچ رہا تھا۔

سب جانتے کہ کیا سوچ رہے ہیں۔ لیکن اس روز تو غضب ہی ہو گیا۔ میں بچوں کو اسکول بھیج کے خود کالج جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی کہ صائمہ خالہ کا فون آیا۔ رُندھے ہوئے گلے سے پوچھ رہی تھیں کہ تمھارے خالو تمھاری طرف تو نہیں گئے ہیں؟ اتنا کہتے کہتے ان کا گلا بھر آیا۔ میں ہیلو ہیلو کرتی رہی مگر ادھر سے محض سسکیوں کی آواز آرہی تھی۔ میں نے فون کٹ کیا اور خالہ کے چھوٹے بیٹے آفتاب کو فون کیا۔ آفتاب نے بتایا کہ ابا کل ظہر کی نماز کے لیے گھر سے نکلے تھے اور واپس گھر نہیں لوٹے ہیں۔ میں حیران کہ پروردگار یہ ماجرا کیا ہے؟ میں نے فوراً ڈرائیور کو گاڑی نکالنے کے لیے کہا اور کالج جانے کے بجائے صائمہ خالہ کے گھر پہنچی۔ گھر پہ ماتم پسرا تھا۔ سب خاموش بیٹھے تھے۔ خالہ کی سسکیاں تھوڑی تھوڑی دیر پہ سنائی دیتی۔ آفتاب نے بتایا کہ ابا جب دیر رات تک نہیں لوٹے تو ہم نے ایک ایک کر کے سبھی رشتہ داروں کو فون کیا۔ پھر پولس کمپلینٹ بھی درج کرائی۔ آج گاؤں بھی فون کر کے معلوم کیا۔ کہیں کچھ اتا پتا نہیں۔ ابا کسی سے ناراض بھی نہیں تھے۔ کسی بات کی پریشانی بھی نہیں تھی۔ کل بھیا نے پانچ ہزار روپے دیے تھے ابا کو جیب خرچ کے لیے، وہ روپے بھی الماری میں یوں ہی رکھے ہیں۔ کہتے کہتے آفتاب کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔

شام تک کچھ کھوج خبر نہ ملی تو میں واپس گھر آگئی۔ مگر دل اُدھر ہی اٹکا ہوا تھا۔ دراصل خالو جان ہم سب بھائی بہنوں سے بے حد پیار کرتے تھے۔ گاؤں میں ان کی کافی زمینیں تھیں۔ کئی باغات تھے۔ وہ خود اسکول ٹیچر تھے۔ ہیڈ ماسٹر کے عہدے سے رٹائر ہوئے تھے۔ گاؤں میں ان کی بڑی عزت تھی۔ امیر غریب سب ان کے قدر دان۔ عید، بقرعید، ہولی، دیوالی

سب تہوار ان کے اپنے تہوار تھے۔ رام بلاس کاکا سے ان کی بڑی گہری دوستی تھی۔ رام بلاس کاکا اکثر اپنے امرود کے باغ میں چارپائی ڈال کے بیٹھے رہتے۔ چھٹیوں میں ہم سب بھائی بہن خالو کے گاؤں جاتے تو امرود کے باغ پہ دھاوا ضرور بولتے۔ امرود کے باغ میں طوطوں کا جھنڈ آ کے بیٹھتا، جس کو باغ کی رکھوالی کرنے والا کھلاون اُڑاتا رہتا۔ لال چونچ اور ہرے پنکھ والے طوطوں کو دیکھنا ہمیں بہت پسند تھا۔ لیکن کھلاون ان طوطوں کا دشمن تھا۔ انھیں بیٹھنے ہی نہیں دیتا۔ ایسے میں کہیں سے خالو نکل آتے تو ہم سب کو طوطوں کے بارے میں بہت سی کہانی سناتے۔ امرود کی بہت سی قسموں کے بارے میں بتاتے۔ الہ آبادی امرود کی خوبیاں بیان کرتے کرتے جھک کے مٹی اُٹھاتے اور کہتے دیکھو مٹی کی خوشبو اصل خوشبو ہوتی ہے۔ پھر ہمیں چکنی مٹی، بلوا مٹی، کالی مٹی، دومٹ مٹی اور نہ جانے کس کس مٹی کے بارے میں بتاتے۔ گنگا کنارے کی مٹی کی زرخیزی کا ذکر کرتے۔ کہتے کہ وضو کا پانی نہ ہو تو ہم مٹی سے تیمم کر کے عبادت کرتے ہیں۔ اسی مٹی پہ سجدہ کرتے ہیں تو ہمارا رب ہم سے خوش ہوتا ہے۔ وہ مٹی کی فضیلت بیان کرتے رہتے اور ہم سب بچے امرود کھانے اور طوطوں کے جھنڈ کو دیکھنے میں مصروف رہتے۔ خالو جان مٹی کے بارے میں نہ جانے کیا کیا کہتے جو ہم بچوں کی سمجھ میں نہیں آتی۔ خالو جان رام بلاس کاکا سے کہہ کے ہمارے لیے جلیبیاں منگواتے۔ سب بچوں سے حمد، نعت اور بھجن سنتے۔ جو اچھی آواز اور صحیح تلفظ کے ساتھ سناتا اسے انعام دیتے۔ انھیں بچوں سے اور مٹی سے بہت پیار تھا۔

یہی سب سوچتے سوچتے نہ جانے کب میری آنکھ لگ گئی۔ صبح جب نیند کھلی تو سب سے پہلے خالو جان یاد آئے۔ فوراً آفتاب کو فون ملایا۔ اس نے مایوسی بھرے لہجے میں بتایا کہ آپا کہیں سے کوئی خبر نہیں۔ میری آنکھیں بھی نم ہوگئیں اور پھر اسی طرح پندرہ دن گزر گئے۔ خالہ جان کا رو رو کے برا حال تھا۔ اچھے ہنستے مسکراتے گھر میں ماتمی دھُن سنائی دینے لگی۔ کب صبح ہوئی اور کب شام ہوئی کچھ پتہ نہیں چلتا۔ میں بھی تقریباً ہر روز صائمہ خالہ کے گھر جاتی۔ اب تو ان کے آنسو بھی خشک ہو چکے تھے۔ میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کے خالہ جان پوچھتیں، بیٹا تمھارے خالو آخر کہاں گئے ہوں گے؟ زندگی میں انھوں نے کبھی کوئی بے اصولی نہیں کی۔ کسی کا دل نہیں دکھایا۔ جب تک نوکری کی ایمانداری سے کی۔ کبھی دیر سے اسکول نہیں جاتے تھے۔ گھر آ کر محلے بھر کے بچوں کی پڑھائی کا جائزہ لیتے تھے۔ صبح فجر کی نماز ادا کرتے، تلاوت کرتے اور ہلکا ناشتہ کر کے اپنے کھیتوں کی طرف جاتے تھے۔ باغوں کی دیکھ بھال کرتے۔ پیڑ دوں سے انھیں بہت لگاؤ تھا۔ خالہ جان ابھی یہی سب باتیں کر ہی رہی تھیں کہ بڑے بھائی جان کے فون کی گھنٹی بجی۔ بڑے بھائی جان باتھ روم میں تھے۔ وہیں سے آواز دی کہ دیکھو میرا فون ریسیو کرلو۔ میں نے بڑھ کے فون اُٹھایا تو دوسری جانب سے رام بلاس کاکا کی آواز آئی۔ بولے بیٹا گھبرانے کی جرورت نہیں۔ بھائی صاحب میرے گھر پر ہیں۔ نہ جانے کیا ہوا ہے۔ کچھ بولتے نہیں۔ آج دوپہر میں کھیتوں کی طرف جا رہا تھا تو یہ اپنے ٹیوب ویل والے کھیت میں بچوں کی طرح مٹی سے کھیل رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر گلے سے لپٹ گئے۔ لگتا تھا کئی دن سے کچھ کھائے پے نہیں ہیں۔ مٹی مٹی ہو رہے تھے۔ لگتا ہے سہر سے گاؤں تک پیدل ہی چل کر آئے ہیں۔ پاؤں میں سوجن ہے۔ میں اپنے ساتھ گھر لے آیا ہوں۔ راستے میں نیم کے پیڑ سے لپٹ کے رونے لگے تھے۔ گھر آئے ہیں، کچھ کھا پی کے سو گئے تھے۔ ابھی سو کر اٹھے تو بہت خوس ہیں۔ بول رہے ہیں کہ رام بلاس بھائی اصل خوسبو تو مٹی کی خوسبو ہے۔

Dr. Qudsia Nasir
Flat No. 304 - B,
Susheel Suhag Building No. 367/B-1,
Munirka, Opp. JNU Main Gate
New Delhi- 110067

فرہنگ آصفیہ سے

صریر۔ ع۔ اسم مؤنث۔ (۱) قلم کے چلنے کی آواز۔ دروازے کی چول کی آواز۔ ٹڈیوں کے اڑنے کی آواز۔

اسیر اس کے خرامِ ناز کے مضموں میں لکھتا ہوں
صریرِ کلک بھی سوتے ہوئے فتنے جگاتی ہے (اسیر)
گر لکھوں مضمون اپنے نالۂ پرشور کا
لوں صریرِ خامہ سے میں کام بانگِ صور کا (ذوق)
غم نامہ اپنا صفحہ محشر سے کم نہیں
ہے شور الغیاث صریرِ قلم نہیں (ذوق)

(۲) مطلق آواز۔ صدا

کہتے ہیں شورِ قیامت جس کو وہ اے چشمِ یار
تیرے مستوں کی صفیرِ خواب غفلت ہو تو ہو (ذوق)

صعوہ۔ ع۔ اسم مذکر۔ ممولا۔ ایک چڑیا کا نام جس کی لمبی دم ہر وقت اور جلدی جلدی حرکت کرتی رہتی ہے۔ اللہ میاں کی دھوبن۔ جھانیو۔

کہانیاں

صالحہ صدیقی

شہادت

قیصر باغ کی سفید بارہ دری سے نواب آصف الدولہ کی قبر سے ہوتے ہوئے چھتر منزل کو پار کرتی وہ بی۔ ایم۔ ڈبلیو تیز رفتار سے شہید اسمارک کے بغل سے گزر کر سیدھے ریزی ڈینسی کے صدر پھاٹک کے سامنے رکی۔ میٹیلک بی ایم۔ ڈبلیو۔ ایس۔ یو۔ وی کا اگلا دروازہ کھول کر ایک نوجوان باہر نکلا۔ نیلی جینس، آسمانی میریٹو کاٹن کی قمیص، آنکھوں پر پولیس کا چشمہ اور پیروں میں ڈارک ٹین اٹیلین لوفرس۔۔۔۔ نوجوان مڑتا ہے اور گاڑی کی دوسری طرف کا دروازہ کھولتا ہے۔۔۔ "کم آؤٹ بے بی۔" ایک انتہائی حسین وجمیل خوبصورت لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر باہر نکالتا ہے۔۔۔ بروکیڈ کا کام کیا ہوا نیلا اور گلابی چوڑیدار پجامہ سوٹ کمخواب کا کام کیا دوپٹہ بڑی بڑی نشیلی کالی آنکھیں، یہ کہاں لے آئے۔۔۔؟ اس نے کہا جیسے کوئل کوکتی ہے، ویلس ایز ہسٹری بے بی۔۔۔ میں اپنی زبان سے تاریخ کو تمھارے لیے زندہ کر دوں گا پھر سے تمھیں بتاؤں گا غدر کی کہانی۔ 1857 کا احساس۔۔۔ اوہ۔۔ کتنا ڈیپریسنگ ہے یہ صرف مار کاٹ۔۔۔ کہیں اور لے چلو نا۔۔۔ صرف مار کاٹ؟ نہیں سویٹ ہارٹ۔۔۔ شہادت کے نہ جانے کتنے قصے اور رومانیت۔۔۔۔ اس موت کے ماحول میں خون اور میدے کے اس کنج میں جیسے کھلتا تھا محبت کا ایک کمل۔۔۔ آؤ بتاتا ہوں کہتے ہوئے نوجوان لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر ریزیڈینسی کے اندر داخل ہوتا ہے، یہ دیکھتی ہو داہنی طرف یہی مین بلڈنگ تھی اور یہ گول گول چھید دیکھ رہی ہو دیواروں پر، یہ توپ کے گولوں کے نشان ہیں۔۔۔ اور وہ سامنے ڈاکٹر فرائز ہاؤس جہاں سیکڑوں انگریز سپاہیوں نے بنا دوا اور علاج کے دم توڑ دیے تھے۔

دوپہر کی دھوپ کی ترچھی کرنیں بیلی گارد کے ٹوٹے، پھوٹے جر جر کنگوروں سے چھن چھن کر ہری دوب پر پڑ رہی تھی۔ ایک ریک ٹینگلر دھوپ کے ٹکڑے میں دونوں بیٹھے تھے۔ لڑکی نے اپنے بیگ سے ایک دفتی کا پیکیٹ نکالا، اسے کھولا اور اس میں رکھے پیزرے کے ٹکڑے کو لڑکی نوجوان کو دیتے ہوئے۔ گارلیک پیزا ہے تمھیں بہت پسند ہے نا عمران، نوجوان نے پیزرے کے ٹکڑے کو منہ میں ڈالا اور کھاتے ہوئے بولا تم کہہ رہی تھی نا شگفتہ ریزیڈینسی صرف مار کاٹ کی کہانی سے جڑی ہے، ایسا نہیں ہے، گزٹ پڑھو گی تو جانو گی، ایلین ولیمسن کی قربانی کی کہانی۔۔۔ اس کی محبت کی داستان۔۔۔ تو بتاؤ عمران، کون تھی ایلین۔۔؟ کیا ہوا تھا یہاں 1857 میں۔۔۔؟

ہاں۔۔۔ 1857 جون کا مہینہ لکھنؤ میں چاروں طرف پھیل چکی تھی غدر کی آگ۔۔۔ انگریز سپاہی سکندر باغ تک پہنچ چکے تھے اور کانپور کی طرف سے ابلیس کی دوسری صورت میں جنرل آؤٹرام بڑھا آرہا تھا۔۔۔ لیکن دیسی سپاہی جیسے گھیرا توڑنے کو تیار ہی نہیں تھے۔ لال پل سے کم سے کم تین میل آگے قیصر باغ تک پھیلے ہوئے تھے دیسی سپاہی۔۔۔ اور لگاتار بیلی گارد پر چھوٹی توپوں اور ماسکیٹو سے گولی باری ہو رہی تھی۔ رات ہو چکی تھی۔ گولا باری کچھ ہلکی پڑی تھی۔ ایلین ڈاکٹر فرائز ہاؤس میں گھائلوں اور بیماروں کی تیمارداری کر رہی تھی۔ ان کے شوہر لیفٹیننٹ رابرٹ ایڈورڈ ریزیڈنسی کی سب سے اونچی گنبد پر کھڑے آس پاس کے نظاروں کا جائزہ لے رہے تھے کہ اچانک ماسکیٹ کی ایک گولی ان کے سینے میں لگی اور وہ سیدھے گنبد سے نیچے آ کر

گر گئے۔ نیچے پہرے داری کر رہے جوانوں نے خون سے لت پت رابرٹ کو اٹھایا، اور ڈاکٹر فرائز ہاؤس لے آئے۔ ایلین نے گھاؤ کی جانچ کی تو پایا گھاؤ بہت گہرا ہے، زہر پھیل سکتا ہے لیکن کوئی اینٹی سیپٹیک دوا نہیں، جنرل ہیرز سے اجازت لینا بیکار ہے، اس وقت وہ خود ہوش میں نہیں ہے، ان کے کندھے کا گھاؤ ناسور بنتا جا رہا ہے، ریزیڈینسی کی کمان اس وقت کسی کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ ایلین نے تیزی سے کمرے میں چکر لگاتے اپنے دونوں ہاتھوں کو ملتے ہوئے سوچا۔ مجھے خود ہی کچھ کرنا پڑے گا۔

بیلی گارد کے اندر ہی مزار تھی، غفران خاں بابا کی مزار۔۔۔ وہی رہتے تھے صادق میاں، ایلین بدحواس بھاگتی ہوئی مزار تک گئی دوسری طرف گھیرا بڑھ رہا تھا گولی باری جیسے رکنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی، اور اب تو عالم باغ سے چلنے والے انگریزوں کے گولے بیلی گارد تک پہنچ رہے تھے۔ بابا۔۔۔ بابا۔۔۔ بابا میرا آدمی کی چھاتی میں گولی لگا ہے بابا کندھے میں بھی گہرا زخم آیا ہے، بابا دوا لانے کا کوئی ذریعہ نہیں، اب آپ ہی کچھ بتائے بابا۔ اللہ حق۔۔۔۔ میری بات سنیے بابا۔۔۔ اللہ۔۔۔ حق! بابا میری بات سنیے۔۔۔ اللہ حق۔۔۔ بابا پلیز میری بات سنیے کوئی ذریعہ نہیں ہے؟ (روتے ہوئے ایلین کہتی ہے) اللہ کو یاد کر اے لڑکی۔۔۔ جا نکل جا۔ گھیرا توڑ کر نکل جا۔۔۔ دوا لے آ، تجھے کوئی نہیں روکے گا۔۔۔ جا۔۔۔ دوا لے آ۔۔ اللہ حق! پاگلوں کی طرح سے ایلین واپس آتی ہے۔ تیزی سے دوڑتے ہوئے ریزیڈنسی کے پھاٹک سے باہر نکلتی ہے۔ چاروں طرف گولی باری چل رہی ہے، راستے راستے کے کناروں پر جل رہی ہے آگ۔۔۔ اور پورا لال بارا دری لاشوں سے پٹا۔۔۔ چہرا ڈھانک کر، سڑتی لاشوں کی سڑھاندھ اور گہری بدبو سے بچتے ہوئے بھاگی چلی جاتی ہیں ایلین اکبری دروازے کی طرف، لیکن یہ کیا؟ جہاں حکیم صاحب کا دوا خانہ تھا، وہاں اب بچی تھی صرف راخ۔۔۔! بہت سارے انگریز رنگ روٹھ وہی کھڑے ہو کر بوتلوں سے شراب پی رہے تھے اور کوئی بہت بھدا سا گانا گا رہے تھے۔ ایلین الٹے منھ لوٹی، اور پھر ویسے ہی دوڑتے ہوئے کسی طرح سے گھیرا توڑتے ہوئے ریزیڈنسی پہنچ گئی۔ بھاگ کر سب سے پہلے رابرٹ تک پہنچی۔ اس نے دیکھا ابھی سانس چل رہی ہے، لیکن گولی کے بارود کا زہر جسم میں پھیلتا جا رہا تھا، کیا ہوگا۔۔۔؟ ایلین نے سوچا، تبھی ذہن میں ایک ترکیب آئی، پاگلوں کی طرح دوڑ کر مزار کا رخ کیا، سجدے میں جھکے ہوئے بابا کے بالکل سامنے بیٹھ گئی۔ نہیں ملی دوا بابا۔۔۔ ہمیں معلوم ہے لڑکی۔۔ اب کیا ہوگا بابا۔۔۔ تجھے کیا چاہیئے لڑکی۔۔۔ بابا اپنے شوہر کا زندگی چاہیے۔ زندگی مل سکتی ہے لیکن اس کے بدلے میں دینی ہوگی ایک اور زندگی۔۔۔ بول۔۔ منظور ہے، آپ کیا کہہ رہے ہیں بابا۔۔۔ ہاں تم جو سمجھ رہی ہو ہم وہی کہہ رہے ہیں، تیرا شوہر جی جائے گا، اس کی زندگی بچ جائے گی، لیکن اس کی جگہ کوئی ایک مرے گا۔۔۔ وہ کون ہوگا؟ یہ تم سوچوگی، آپ کیا کہتے ہیں بابا۔۔۔ (کچھ سوچتے ہوئے ایلین) میرا ہسبینڈ کو زندگی دینے کے لیے میں مرے گا۔ سوچ لے لڑکی۔۔۔ جان کے بدلے جان۔۔۔ پھر سے سوچ لے، تو مانگتی ہے اس کی زندگی۔۔۔ اور اپنی موت۔۔۔ بتا۔۔۔ نہیں۔۔۔ مرنا تو پڑے گا کسی کو، ضدمت کر لڑکی وقت بہت کم ہے بول۔۔۔! مرے گی تو اپنے شوہر کے لیے۔۔۔ جلدی جواب دے بتا کیا فیصلہ ہے تیرا۔۔۔ ایلین ہاں بابا۔۔۔! مروں گی بول تین مرتبہ۔۔ بول، ہاں مروں گی، مروں گی، مروں گی۔۔۔۔ اور دوڑتے ہوئے ڈاکٹر فرائز ہاؤس کی طرف جاتی ہے۔ دواؤں کی ایک نئی کھیپ، پہنچ چکی ہے اس میں ہے ہر طریقے کے بایوٹیکس۔۔۔ ان دواؤں سے زہر نہیں پھیلے گا۔۔۔ ایلین جلدی سے انجیکشن بناتی ہے اور رابرٹ کو لگاتی ہے، لیکن یہ دوائیں کافی نہیں تھی، انجکشن سے اتنا فائدہ ہوا کہ دھیرے دھیرے رابرٹ کی حالت پہلے سے کچھ سدھرنے لگتی ہے، شام ڈھل جاتی ہے، تیز پسینے کے بعد رابرٹ کا بخار بھی اتر جاتا ہے، جسم کا اکڑنا بھی دھیرے دھیرے کم ہو جاتا ہے۔

بالکل اندھیری رات۔۔۔۔ بیلی گارد پر آج چاند نہیں چمک رہا۔۔ اکا دکا توپوں کے چلنے کی آواز ایسے میں مزار کی طرف دھیرے دھیرے بڑھ رہی ہے ایلین۔۔۔۔ مزار کے قریب پہنچ کر دھیرے سے آواز دیتی ہے لطیف۔۔۔ محمد لطیف۔۔۔! جی میم صاحب، لطیف تمھارے رابرٹ صاحب کو گولی لگی ہے کچھ دواؤں کی سخت ضرورت ہے۔ ان کی زندگی بچانے کے لیے وہ دوائیں یہاں نہیں ہے، لانی پڑیں گی۔ چار باغ سے انگریزی دوائیں مل جائیں گی، آپ حکم کیجیے میم صاحب۔۔۔ میں خود چلا جاتا ہوں۔ تمھارے جانے سے کام نہیں چلے گا لطیف! ایک منٹ میں پہچان لیے جاؤ گے، جس کے بعد تمھارے جسم کی ایک ایک بوٹی نوچ ڈالیں گے وہ غدر کے سپاہی، مجھے خود جانا پڑے گا۔ کیا کہہ رہی ہیں میم صاحب، میں جتنا کہتی ہوں اتنا کرو لطیف۔۔ میں اردو بولنا جانتی ہوں، اپنے شوہر کو بچانے کے لیے جان پہ کھیل جاؤں گی۔۔ بہت بڑا خطرہ ہے میم صاحب، جانتی ہوں لطیف۔۔۔ لیکن

اور کوئی طریقہ نہیں۔۔۔سنو! تمہارے پاس اس غدر کے رنگروٹ کی وردی ہے نا، جو مارا گیا تھا۔ جی۔۔۔! وہ لے آؤ۔۔۔اور ہاں ایک مردہ سینک کا خون کٹوری میں بھر کر لاؤ۔۔۔وقت نا گنواؤ لطیف جلدی کرو، میں ڈاکٹر فرائرز ہاؤس میں ہوں، کہہ کر تیزی سے لوٹ پڑتی ہے ایلین۔۔۔دور سے لال پل کی طرف سے سنائی پڑتی ہے فرنگیوں کی فوج کے ڈرم کی آوازیں۔۔۔پھر چاروں طرف سناٹا۔ جھینگرو کی جھینگ۔جھینگ۔۔۔اور بیچ بیچ میں کسی گھائل کی کراہ۔۔۔ورزن میری مدر آف گاڈ۔۔۔ایلین پراتھنا کرتی ہوئی تیزی سے ڈاکٹر فرائرز ہاؤس میں داخل ہو کر رابرٹ کے بیڈ تک پہنچتی ہے، سینے کے زخم کے باہر نیلے گھیرے کا نشان پڑتا جا رہا ہے۔اپنے ہاتھوں کو مسلتے ہوئے ایلین نے دیکھا، زہر پھیلتا جا رہا ہے صبح ہونے سے پہلے اینٹی بایوٹک دینا ہی پڑے گا۔۔۔(ایلین نے اپنے من میں سوچا) اور رابرٹ کے ماتھے کی پٹی بدلی، میم صاحب یہ وردی۔۔۔ہاں! لاؤ لطیف۔۔۔اور خون؟ جی یہ رہا کٹورے میں، رکھ دو اور سنو لطیف اس بستر کے سرہانے بیٹھے رہو، اور ہر دس پندرہ منٹ پر پٹی بدلتے رہنا۔۔۔ٹھیک ہے، میں دیکھتی ہوں کیا ہو سکتا ہے۔

ایلین وردی اور کٹورا لے کر ایک اندھیرے کونے کی طرف نکل جاتی ہے، اور لطیف لیفٹیننٹ رابرٹ کے ماتھے کی پٹی بدلتا ہے کہ اچانک جوتوں کی آواز آتی ہے لطیف سر اُٹھا کر دیکھتا ہے سامنے خون سے لت پت بارود کی کالک سے ڈھکا چہرا لیے ایک غدر کا رنگروٹ کھڑا تھا۔ہاتھ میں لی اینفیلڈ کی ماسکٹ، اور کندھے پر میرٹھ کی کمپنی کی گیریسن نشان۔اندر کیسے آئے بھائی۔۔۔کون ہو تم؟ لطیف کے پوچھنے پر رنگروٹ نے کہا، تب ٹھیک ہے، جب تم ہی مجھے نہیں پہچان پائے لطیف تو اور کون پہچان پائے گا۔میم صاحب آپ؟ آواز بھی بدل لی۔(لطیف نے سوالیہ نظروں سے کہا) ہاں لطیف۔۔۔میں۔۔۔بچپن میں ولایت میں اسکول کالج میں ڈرامہ کھیلتی تھی، وہی آج کام آرہا ہے، میرا گھوڑا کہاں ہے؟ بالکل مزار کے پیچھے کی طرف املی کے درخت سے بندھا ہوا ہے۔ چارا دیا تھا اسے؟ (ایلین نے پوچھا) جی میم صاحب! چارا پانی سب دیا تھا۔ٹھیک ہے میں چلتی ہوں، صاحب کا خیال رکھنا۔کہہ کر ایلین تیزی سے مزار کی طرف بڑھ جاتی ہے۔گھوڑے کو کھولتے ہوئے اس کے ماتھے کو سہلاتی ہے اور کان کے پاس منہ لے جا کر کہتی ہے بیگر۔۔۔بیگر، وی ہیو آ ٹمیسٹ ٹو نائٹ کم۔۔۔لیٹس پُروو آ سیلف۔ اُچھل کر بنا رکاب پر پیر رکھے گھوڑے پر سوار ہوتی ہے اور ایڑ لگاتی ہے، گھوڑا پلک جھپکتے ہی ہوا سے باتیں کرنے لگتا ہے۔ایلین بیلی گارد کے پچھلے دروازے سے نکل کر قیصر باغ کی طرف داہنے مڑ کر نہیں بلکہ تیزی سے بائیں اور پکے پُل کی طرف بگلر کو بڑھا دیتی ہے پکا پُل پار کر کے، بائیں پھر داہنی طرف ہوا کی تیزی سے کیزی ایمسی کی طرف گھوڑا بڑھا دیتی ہے۔تبھی آگے ٹھیک بڑا جے کے سامنے والے شاہ کی مزار کی طرف سے چلے آرہے تھے سیکڑوں دیسی پلٹن کے رنگروٹ۔۔۔ان کے ڈراؤنے چہروں پر جیسے موت خود اُتر آئی ہو۔نعرے بلند کرتے ہوئے پیچھے کی طرف سے ریزیڈنسی پر حملہ کرنے کے لیے آگے بڑھے آرہے ہیں۔۔۔مغلیہ سلطنت زندہ باد۔۔۔نعرے جیسے آسمان کے سینے کو چیر دیں گے، ظلِ الٰہی بہادر شاہ ظفر زندہ باد۔۔۔مغلیہ سلطنت۔۔۔زندہ باد۔۔۔زندہ باد۔۔۔نعرۂ تکبیر۔۔۔اللہ اکبر۔۔مغلیہ سلطنت۔۔۔زندہ باد! اچانک آٹھ دس رنگروٹ آ کر ایلین کو گھیر لیتے ہیں، کہاں سے آرہے ہو؟ ایک بڑی مونچھوں والا لمبا چوڑا حولدار آ کر پوچھتا ہے۔سینہ پکڑ کر ایلین گھوڑے کی زین پر آگے جھک جاتی ہے، آواز بدل کر (زخم کی شدت میں درد بھری آواز) کہتی ہے، کسی طرح سے جان بچا کر بھاگ آیا ہوں بیلی گارد سے! سینے پر گولی لگی ہے۔میرا چار باغ پہنچنا ضروری ہے، انگریزوں نے ساری توپیں بیلی گارد کے پچھلے دروازے پر لگا دی ہیں۔ایک بھی سپاہی لال پل پار نہیں کر پائے گا، بیلی گارد پہنچنا تو دور کی بات ہے۔بہتر یہی ہوگا کہ آپ لوگ یہی وکٹوریہ گنج میں نہیں تو بجاجے میں ہی قیام کر لیجیے۔آگے بڑھنا خطرے سے خالی نہیں، صبح دیکھیے گا۔۔(ایلین کی بات کاٹتے ہوئے) کیا بات کرتے ہو رنگروٹ! حولدار جیسے غصے میں اُبل پڑتا ہے، آؤٹرام عالم باغ کے پاس تک آ چکا ہے! اور صبح تک تو وہ یہاں ہوں گے، ہم دوہری مار میں پس جائیں گے۔یہ میں نہیں جانتا حولدار صاحب! میں جتنا جانتا تھا آپ کو بتا دیا، بیلی گارد میں جتنی توپیں ہیں سب لال پل کی طرف تان دی گئی ہیں۔ آگے بڑھنا موت کے منہ میں جانا ہوگا۔میرا گھاؤ رِس رہا ہے، کمزوری بھی بہت ہے مجھے جانے دیجیے، کسی طرح سے چار باغ پہنچ جاؤں۔

حولدار اپنی بیلٹ سے ایک کینٹین نکالتا ہے، اس میں برانڈی ہیں رنگروٹ۔۔۔تھوڑا سا پی لو اور تھوڑا سا زخم پر لگا۔۔۔زہر نہیں پھیلے گا۔۔ٹھیک ہے حولدار صاحب میں گھاؤ پر لگا لوں گا۔لیکن میں اسے پی نہیں سکتا، برہمن ہوں، رام نرائن سنگل۔۔۔ہمارے دھرم میں منع ہے۔ ٹھیک ہے۔۔۔ٹھیک ہے! زخم پر ہی لگا لو۔ایلین کینٹین لے کر وردی میں جہاں گولی لگنے کا سوراخ بنا ہے، وہاں انڈیلتی ہے۔اُف۔۔۔!

(آواز سن کر حولدار کہتا ہے) بڑی جلن ہو رہی ہے رنگروٹ ۔۔گھبراؤ مت ابھی ٹھیک ہو جائے گا جاؤ ۔۔اب تم جاؤ قیصر باغ چوراہے سے داہنے مڑنا، اشوک کی لاٹ کے پاس تمھیں ترسٹھویں بٹالین کے سپاہی ملیں گے، انھیں بتا دینا کہ حولدار منٹو سنگھ نے بھیجا ہے بجاجے کے پاس، وہ تمھیں نہیں روکیں گے، اب جاؤ وقت ضائع نہ کرو۔ ایلین گھوڑے کو ایڑ لگاتی اور سرپٹ چال سے گومتی کے کنارے کنارے قیصر باغ کی طرف بڑھ جاتی ہے، چھتر منزل کے پاس سے ہی اسے سنائی پڑنے لگتی ہے زوردار نگاڑوں کی آواز اور آسمان کو پھاڑ دینے والے نعرے۔۔۔ سلطنت مغلیہ ۔۔۔زندہ باد ۔۔۔ بہادر شاہ ظفر زندہ باد۔۔۔نعرۂ تکبیر۔۔۔ اللہ اکبر۔۔۔۔۔ ہر ہر مہادیو۔۔۔! سپاہیوں کا جیسے ایک سیلاب سا اُمڑا چلا آ رہا تھا، قیصر باغ چوک کے بیچ کھڑی اشوک کی لاٹ کی طرف۔۔۔! نعرے جیسے تھمنے کا نام ہی نہیں لیتے تھے۔ بیچ بیچ میں گولیاں چلنے کی آواز اور اس اندھیری رات میں بھی تلواروں کی چمک گولیوں کی آواز سے بگڑ رہے گھوڑوں کی تیز ہنہناہٹ۔۔۔! اور چاروں طرف پھیلی کچے بارود کی بو۔۔!

بالکل اشوک کی لاٹ کے پاس سے گھڑسواروں کا ایک دستہ تیزی سے آگے بڑھ کر ایلین کو چاروں طرف سے گھیر لیتا ہے۔ ایلین دیکھتی ہے سب سے آگے کالے اور سفید چت کبرے عربی گھوڑے پر سوار ایک لحیم شحیم انسان! چہرے پر خشخشی داڑھی ترای ہوئی مونچھیں، اور سر پر پٹھانی پگڑی آواز میں جیسے بادلوں کی گونج۔ میں ہوں بخت خاں! (سوار کہتا ہے) مغل بادشاہ کا سپہ سالار! جنرل بخت خاں، تم کون ہو لڑکے؟ اور یہاں کیا کر رہے ہو؟ ایلین گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے ہی سلیوٹ کرتی ہے۔ رام نارائن شکل ہوں جنرل! بتیسویں بٹالین گھڑسوار پلٹن! میرٹھ سے آیا ہوں جنرل، بیلی گارد کی لڑائی میں گولی لگ گئی، چار باغ جا رہا ہوں دوا لینے۔ جلدی پہنچنا ہے، نہیں تو زہر پھیل جائے گا۔ ٹھیک ہے! بالکل سیدھے بازار خالا ہو کر نکل جاؤ پھر تلی موہانی سے بائیں مڑنا، چار باغ پہنچ جاؤ گے۔ راستے میں انگریزی پلٹن تو نہیں ہیں جنرل صاحب! لکھنؤ میں دور دور تک کہیں انگریز نہیں ہیں رنگروٹ، سارے انگریز چھپ گئے۔ یا مار دیے گئے ہیں، اب ہندوستان ہمارا ہے، نکل جاؤ بے خوف ۔۔۔! ٹھیک ہے تو چلتا ہوں جنرل صاحب ۔۔۔ گھوڑے کو ایڑ لگاتی ہے، ہر ہر مہادیو۔۔۔۔! گھوڑا تیزی سے آگے بڑھتا ہے، ہوا کی تیز رفتار سے بازار خالا پار کر کے چار باغ کے پہلے دروازے تک پہنچ جاتی ہے جہاں سامنے ہی ہے کلارنس ملل کا دوا خانہ!

ایلین گھوڑے کو لگام دیتی ہے اور راس زمین پر گرا کر اندر چلی جاتی ہے۔ سامنے ایک انگریز اردلی کھڑا ہے، کاؤنٹر کے پیچھے۔ آئی وش ٹو اسپیک وتھ ڈاکٹر ملل امیجیلی! کاؤنٹر کے پیچھے والا انگریز دیسی سپاہی کو انگریزی بولتا سن کر چونک جاتا ہے اور جھٹکے سے سپاہی کو دیکھتا ہے۔ آئی ایم ناٹ آبلیگے ٹو سوبجر، آئی ایم برٹش سیٹی جن، این ناگر ایم آئی آ مین (ایلین ٹوپی اُتارتی ہے اور اس کے ریشمی بال کھل کر لہرانے لگتے ہیں) آئی ایم آ وومن! گیٹ می ڈاکٹر ملل رائٹ ناؤ! (انگریز) ایز یو وِش میم! (کہہ کر تیزی سے اندر چلا جاتا ہے) ایلین دھیرے دھیرے چل کر دوا خانے میں رکھی کرسی پر بیٹھ جاتی ہے۔ اندر کے دروازے سے سفید بالوں والا ایک بوڑھا آدمی اندر آتا ہے۔ اس کے ساتھ پہلا والا انگریز! (انگریز انگلی سے اشارہ کرتا ہے) دیٹ از دا وومن ڈاکٹر ۔۔ ڈریسڈ لائک آ مین ۔ ڈاکٹر ملل آگے بڑھتے ہیں۔ یس! وہاٹ ایز دا میٹر؟ ہو آر یو؟ اینڈ وائے آر یو ہیر؟ ڈاکٹر ملل جیسے سوالوں کی جھڑی لگا دیتے ہیں۔ (ایلین کہتی ہے) ڈاکٹر ملل! آئی ایم ایلین ڈونلڈسن، سر ایڈمنڈ سنس ڈاٹر! اینڈ آئی نیڈ یور ہلپ۔ مائی ہسبنڈ از وونڈڈ ایٹ دا ریزیڈنسی آئی نیڈ سم میڈیسنس امیجیلی! (ڈاکٹر ملل ایلین سے کہتے ہیں) یو آر ویلکم میم! آئی انڈرسٹینڈ! وہاٹ میڈیسنس ڈو یو نیڈ ۔۔۔؟ (ایلین جواب دیتے ہوئے) سم بایوٹیک اینڈ آ سیرنج! ڈاکٹر ملل پہلے والے انگریز کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں، گیٹ دا تھنکس پیٹر (پیٹر اندر جاتا ہے اور ایلین سے پوچھتا ہے) وڈ یو لائک ٹو ہیو سم تھنکس میم؟ (ایلین جواب دیتے ہوئے) مے بی ٹی آر لیٹیلی برانڈی وڈ بی فائن ڈاکٹر! کہتے ہوئے ایلین نڈھال کرسی پر گر جاتی ہے۔ ایلین کے لیے چائے کا ایک کپ لا کر ڈاکٹر پیٹر دیتے ہیں اور ایلین سیدھے بیٹھ کر چائے پینے لگتی ہے اور کچھ ہی وقت میں ایلین کی ضرورت کی دوائیاں پیکٹ میں بندھی ہوئی کاؤنٹر پر رکھ دی جاتی ہیں ایلین کرسی سے اٹھتی ہے۔ ہاتھ میں پکڑا کپ کاؤنٹر پر رکھتی ہے۔ ویل تھینک یو ڈاکٹر ملل پرے دیٹ آئی ایمے بل ٹو کیپ مائی ہسبینڈ آلائیو، گاڈ وِتھ یو، مس رابنسن! ایلین تیزی سے باہر نکلتی ہے اور تیزی سے گھوڑا سفید بارادری کی طرف چھوڑ دیتی ہے۔

ریکٹینگولر دھوپ آگے بڑھ چکی ہے اور ریزیڈنسی پر چھانے لگی ہے۔ لمبے لمبے یوکیلپٹس اور دیودار کے گھنے سائے۔ ہوا میں سرہن بڑھ رہی ہے پھر کیا ہوا عمران؟ ایلین پہنچی کی نہیں؟ شگفتہ نے سوال کرتے ہوئے پوچھا۔ تمھارے پاس کافی تھیں نا شگفتہ عمران کے پوچھنے پر شگفتہ

نے حامی میں اپنا سر ہلایا، اور اپنے بڑے سے جھولے سے ایک پلاسٹک اور تھرموویئر کے دو گلاس نکالے، کافی انڈیلتے ہوئے شگفتہ نے عمران سے پوچھا! بتاؤ نا عمران پھر کیا ہوا؟ رابرٹ کا کیا ہوا؟ اور عمران جیسے ایک بار پھر کھو گیا۔ 1857 کی تپتی گرمی میں بہتے لہو کے سیلاب میں صبح نے دستک دے دی تھی اور افق میں کھل رہی تھی نیلے آسمان کو گلابی رنگتی ہوئی لالی۔۔۔صبح صادق کی سحر آمیز ہوا جیسے پھولوں کی خوشبو اور بارود کی گندھ ایک ساتھ بہائے لیے آتی تھی، گھوڑوں کو سرپٹ دوڑاتے ہوئے گومتی کے چھور والے پھاٹک کی طرف بڑھی چلی جاتی تھی ایلین۔۔۔!صرف چار فٹ کی چھار دیواری (ایلین سوچتے ہوئے) بگلر (گھوڑا) اسے آسانی چھلانگ لگا کر آسانی سے پار کر لے گا اور ایڑ لگا دی۔دیسی پلٹن کی وردی میں ایلین بالکل غدر کا سپاہی ہی نظر آرہی تھی۔اچانک ریزیڈنسی کی بُرجی سے تین گولیاں چلیں، ایک گولی ایلین کے بائیں کندھے پر، دوسری اس کی جانگھ کو چیر کر نکل گئی اور تیسری سیدھے بگلر کی کھوپڑی پر۔۔۔اُچھال میں بگلر دیوار پار کر چکا تھا اور چھار دیوار کے اس پار بگلر بے جان ہو کر زمین پر گر پڑا، بگلر اپنے خون سے لت پت پڑا تھا اور ایلین دوائی کا ڈبہ ہاتھوں میں پکڑے ہوئے، مزار کے کنارے کی طرف گھسٹنے لگتی ہے وہاں سے فرائز ہاؤس کی دوری زیادہ سے زیادہ دو سو گز ہو گی لیکن وہاں تک پہنچنا ایلین کے لیے جیسے ناممکن سا ہو رہا تھا، جیسے ایک بے ہوشی سی طاری ہو رہی تھی، لیکن دھیرے دھیرے گھسٹتے ہوئے ایلین مزار کی طرف بڑھنے لگی اور ادھر دوسری طرف قیصر باغ کی طرف بڑھنے لگی گولہ باری۔۔۔!

ٹرنگ۔۔۔ٹرنگ۔۔عمران کا سیل فون بج رہا تھا، کیا۔۔؟ عمران نے فون اٹھا کر کہا کہاں سیز کیا ہے؟ بارہ بروا؟ بارہ برو انہیں عالم باغ کے آگے، ٹھیک ہے، تم لوگ رکو میں پہنچتا ہوں! اٹھو شگفتہ ہمیں جلدی پہنچنا ہوگا، ہماری دواؤں بھرے ٹرک کو پولیس نے سیز کر لیا ہے۔ وہی سے کسی آدمی نے فون کیا تھا ابھی پہنچنا ہوگا۔ میرے ٹرک کے سارے کاغذات ہیں دواؤں کے بھی سب کاغذ موجود ہیں پھر کیسے سیز کر لیا؟(عمران حیرانی سے پریشان ہوتے ہوئے خود سے کہتا ہے) شگفتہ عمران سے سوال کرتے ہوئے کہتی ہے کہ بتاؤ گے نہیں کیا ہوا ایلین کا؟ چلو۔۔چلو گاڑی میں چلو بتاتا ہوں۔دونوں تیزی سے گاڑی میں جا کر بیٹھ جاتے ہیں عمران گاڑی بیک کرتا ہے اور سیدھے ٹیلی فون ایکس چینج ہوتے ہوئے نظیر آباد سے ہو کر چار باغ کی طرف بڑھنے لگتا ہے۔اس کے آگے پھر عالم باغ۔۔۔پھر بارہ بروا وہیں پکڑا گیا ہے ٹرک!(عمران شگفتہ کو بتاتے ہوئے کہتا ہے) پھر کیا ہوا ایلین کا شگفتہ پوچھتی ہے؟

کسی طرح عمران گاڑی کو اوٹو ڈرائیو میں ڈال کر کہتا ہے گھسٹتے گھسٹتے ڈاکٹر فرائز ہاؤس تک ایلین پہنچ گئی۔۔۔اور ٹوٹتی سی آواز میں لطیف کو پکارا لطیف۔۔۔۔لطیف۔۔۔آ گئی میم صاحب (لطیف دوڑ کر آتا ہے) یہ کیا حالت ہو گئی ہے آپ کی میم صاحب!(تکلیف بھری آواز میں) دو گولیاں لگی ہیں لطیف۔۔بایاں کندھا ٹوٹ گیا ہے، بگلر (گھوڑا) اب نہیں رہا، مجھے غدر کا رنگ روٹ سمجھ کر ریزیڈنسی کی برجی سے ہی ماری تھی کسی نے گولیاں۔۔۔۔دوا کا ڈبہ آگے بڑھاتی ہے، اسے کھولو۔۔۔وہ سیرنج نکالو، مائی لاسٹ رسپونس بیلٹی لطیف۔۔۔! میری آخری ذمہ داری اسے پورا کرلوں، لطیف کا سہارا لے کر کھڑی ہو جاتی ہے ایلین۔۔۔اور کسی طرح سے بستر پر بیٹھ کر دوا کا وائل توڑتی ہے۔اس وائل کو پکڑ لو لطیف میرا بایاں ہاتھ کام نہیں کر رہا کہتے ہوئے ایلین سرنج میں دوا بھرتی ہے، پلیز ہلپ می گاڈ! کہتے ہوئے انجکشن لگاتی ہے کہ اچانک رابرٹ کے پپڑی پڑے ہونٹ پھپھساتے ہیں ایلین۔۔۔ایلین!یو ہو کم!یس بیب!مائی سویٹ ہارٹ آئی ایم ہیئر۔۔ اینڈ ول آل ویز بی ایٹ یور سائڈ!اِف ول بی آل رائٹ۔۔۔۔بے بی! کہتے ہوئے ایلین رابرٹ کے اوپر ہی لڑھک جاتی ہے۔میم۔۔۔ میم۔۔!لطیف دوڑ کر آگے بڑھتا ہے، چہرہ تھپتھپاتا ہے یا اللہ۔۔۔۔!میم نے اس دنیا کو الوداع کہہ دیا۔۔۔۔(روتے ہوئے انا للہ وانا الیہ راجعون) اور پھر دھیرے سے خون سے لت پت ایلین کے مردہ جسم کو خالی بستر پر لیٹاتا ہے اور ایلین کی پلکوں کو بند کرتا ہے۔

اچانک عالم باغ پار کرتے ہی اموسی ایئرپورٹ کے بعد والے ویرانے میں ایک جیپ تیزی سے آ کر ایس۔یو۔وی کے سامنے رکتی ہے، عمران کو جھٹکے سے ریکیوم بریک لگانا پڑتا ہے، ایس۔یو۔وی کے رکتے ہی جیپ سے کالے نقابوں سے اپنا چہرہ چھپائے چار اسلحہ دھاری نکلتے ہیں سب سے آگے والا ایس۔یو۔وی کی ڈرائیونگ کھڑکی کے پاس آتا ہے رائفل کھڑکی کی طرف تان کر۔۔۔عمران صاحب! شگفتہ ٹرانسپورٹ کا مالک تو ہے۔"ہاں"۔۔۔بولو! باہر نکلو حرام خور۔دیکھیے۔ دیکھیے آپ کو کوئی غلط فہمی ہو رہی ہے، میں وہ نہیں جسے آپ ڈھونڈھ رہے ہیں۔تمھارا ہی ٹرک پکڑا گیا ہے بارہ بروا میں، ہاں۔۔۔! لیکن۔۔۔نقاب پوش عمران کو بولنے نہیں دیتا اور کہتا ہے تیری کوئی ٹرک پکڑی نہیں گئی، وہ فون ہم لوگوں نے ہی کیا تھا تجھے اغوا کرنے کے لیے ہا۔۔۔ہا۔۔۔۔ہا! باہر نکل! دروازہ کھول کر عمران کا، کالر پکڑ کر کھینچنے لگتا

ہے، کھینچ تان میں شگفتہ عمران کے بیلٹ میں لگی پسٹل نکال لیتی ہے۔یہ عورت۔۔۔نقاب پوش شگفتہ کی طرف دیکھتا ہے، تبھی دوسرا نقاب پوش بولتا ہے ،ہم جانتے ہیں تو گاڑی چلا لیتی ہے، جا! گھر جا۔۔۔اور بتا دے کہ تیرا شوہر اغوا کرلیا گیا ہے۔ڈھائی کروڑ کی فیروتی کے بعد ہی اس کی بوٹی دیکھ پاؤگی۔اور خبردار جو پولیس کو اطلاع کرنے کی حماقت بھی کی۔۔۔ہمیں پتہ چل جائے گا، تم میں سے ایک بھی زندہ نہیں بچے گا ،ہم فون کریں گے اور جہاں بتائے ،وہاں روپیہ پہنچا دینا، چل۔۔۔حرام خور! کہتے ہوئے گھسیٹ کر عمران کو جیپ کی طرف لے جاتے ہیں، شگفتہ کو ڈر نہیں لگتا بلکہ اس کی آنکھوں کے سامنے جیسے لال پھل جھڑیاں چھوٹنے لگتی ہیں۔۔۔اس کے ذہن میں صرف ایک ہی خیال گردش کرتا ہے کہ۔۔۔۔مجھے روکنا ہوگا! عمران کو اس طرح سے اغوا کیے جانے سے مجھے روکنا ہوگا ،داہنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی پستول کو شگفتہ غور سے دیکھتی ہے ،اور اسے یاد آنے لگتا ہے آئی۔ٹی کالج میں کیے گئے وہ این۔سی۔سی کے سینئر انڈر افسری کے دن۔۔۔ایسنائپر فائر میں وہ سب سے آگے تھی، اچانک دروازہ کھول کر وہ باہر نکلتی ہے اور دونوں ہاتھوں سے پسٹل پکڑ کر اسے ایس۔یو۔وی کی چھت پر رکھتی ہے اور کلاسک سوٹرس اسٹینڈ بناتی ہے، داہنا پیر آگے اور جھکا ہوا، بایا پیر بالکل سیدھا اور اینگل پر نظریں۔۔۔۔بالکل عمران کو گھسیٹتے لے جاتے نقاب پوش پر ۔۔۔شگفتہ کچھ بولتی نہیں بلکہ سیدھے نقاب پوش پر دو گولیاں چلاتی ہے، نقاب پوش لڑکھڑا کر گر جاتا ہے۔باقی کے نقاب پوش جب تک سنبھلتے تب تک اپنی گولیوں سے شگفتہ دو کو اور گرا دیتی ہے۔چوتھے نقاب پوش کو موقع مل جاتا ہے ،اس کے ہاتھ میں اے سولٹ رائفل ہے، شگفتہ کی طرف نشانہ سادھ کر ایک شارٹ برسٹ فائر کرتا ہے۔اچانک ایک گولی شگفتہ کے بائیں کندھے کو چیرتی ہوئی اور دوسری گولی جانگھ پر لگتے ہی شگفتہ زمین پر گر پڑتی ہے، پسٹل ابھی بھی شگفتہ کے ہاتھ میں ہے جس میں بچی ہے تین گولیاں۔۔۔شگفتہ کے زمین پر گرنے کی وجہ سے نقاب پوش کا اگلا نشانہ چوک جاتا ہے، وہیں زمین پر گرے گرے صرف داہنے ہاتھ سے رائفل چلانے والے نقاب پوش پر پسٹل خالی کر دیتی ہے شگفتہ۔گولی شاید صرف کندھے کو ہی نہیں پھیپھڑوں کو بھی چھوتی ہوئی نکلی ہوگی ،منہ سے رس رہا ہے بوند بوند خون۔۔۔شگفتہ۔۔۔شگفتہ۔۔۔!

دوڑتا ہوا عمران زمین پر گری ہوئی شگفتہ کے پاس پہنچتا ہے اور اسے اپنی بانہوں میں اٹھاتے ہوئے عمران بھرّائی آواز میں کہتا ہے، شگفتہ یہ تم نے کیا کر دیا؟ ٹھیک ہی کیا عمران۔۔۔۔میں نے وہی کیا جو تمھاری کہانی میں ایلین نے کیا تھا (اٹکتی ہوئی آواز میں شگفتہ کہتی ہے) اب مجھے پتہ چل رہا ہے ایلین کا درد۔۔۔۔یہ مجھے ٹھنڈ کیوں لگ رہی ہے عمران؟ مجھے تم اپنے بازوؤں میں چھپا لو عمران! یہ۔۔۔۔یہ رات کیسے اچانک اتر آئی، یہ کیسا گہرا اندھیرا ہے عمران۔۔۔کوئی تارا بھی نظر نہیں آرہا، تم۔۔۔۔تم کہاں ہو۔۔؟ اپنا چہرا دکھاؤ کہتے کہتے شگفتہ کی آواز جیسے ڈوبتے سورج کی مانند ڈھل جاتی ہے۔عمران پاگلوں کی طرح جیب سے فون نکال کر نمبر ڈائل کرتا ہے، ہاں۔۔۔ہاں۔۔کنٹرول روم دیکھیے ایمرجنسی ہے، میری وائف کو اموسی ایئر پورٹ کے پاس رہ جنوں نے گولی ماردی ہے میں اپنی وائف کو لے کر ہاسپٹل جا رہا ہوں، یہاں چار لاشیں رہ جنوں کی پڑی ہیں۔آپ یہاں آیئے جلدی اور سنبھا لیے۔ شگفتہ کو گاڑی کی پچھلی سیٹ پر لٹا کر پسٹل کو ڈیش بورڈ میں ڈال کر عمران تیزی سے گاڑی موڑتا ہے۔

مہینوں گزر جاتے ہیں۔ایک دن شام ہاتھوں میں پھولوں کا گلدستہ اور ڈھیر ساری موم بتیاں لیے عمران تھکا سا پھر سے بیلی گارد کے اندر پہنچتا ہے، دھیرے دھیرے چل کر عمران قبرستان تک جاتا ہے وہاں کئی ساری قبروں میں سے کسی قبر کو کھوجتے اور اسے پہچاننے کی عمران کوشش کرتا ہے۔کونے میں سوکھے پتوں سے پٹی ایک قبر کے پاس جاتا ہے۔جس کی پٹی پر لکھا ہے ایلین ولیمسن۔۔۔1836-1857 اور اس کے نیچے لکھا تھا۔۔۔''ہیئر لائز ون گیو ہر لائف فور ہر ہسبنڈ'' یعنی یہاں دفن ہے وہ جس نے اپنی زندگی قربان کر دی اپنے شوہر کو بچانے کے لیے، عمران گھٹنوں کے بل بیٹھ جاتا ہے ،اس کی آنکھیں بھر آتی ہیں۔ہتھیلیوں سے سوکھے پتوں کو ہٹاتا ہے اور پھولوں کا گلدستہ قبر پر رکھ دیتا ہے، دھیرے دھیرے جھکتا ہوا اس کا سر قبر پر ٹک جاتا ہے اور کہتا ہے، یہی مانگا تھا ایلین شگفتہ نے مجھ سے۔۔۔مجھے اس دنیا میں اکیلا چھوڑ کر جاتے وقت! کہ سال میں ایک دن میں تمھاری قبر پر آؤں، موم بتیاں جلاؤں اور شگفتہ کے ساتھ تمھیں بھی یاد کروں۔۔۔عمران کانپتے ہاتھوں سے موم بتیاں جلاتا ہے، لمبے بڑھتے اندھیروں کے بیچ موم بتیوں کی لپ لپاتی لو میں عمران کی پرچھائی جیسے ایک رشتہ بُن رہی ہو شگفتہ اور ایلین کے درمیان۔۔!

□□□

Saleha Siddiqui
157/12 Raajpur
Allahabad- 211001(U.P)

ماضی کے سائے

انزیلہ انصاری

دنیا والوں کی سوچ میں 'محبت' سے زندگی جیتی جا سکتی ہے اگر آپ کی زندگی میں کوئی ایسا شخص ہو جو آپ کو خود سے زیادہ محبت کرے تو دوسری چیزوں کی ضرورت خود بہ خود زندگی میں پوری ہو جاتی ہے۔

ثمین ان ہی خیالوں میں گم کئی سال پیچھے جا چکی تھی۔ جہاں اس کی زندگی سب کی طرح نارمل تھی۔ وہ آزادانہ طور پر جی رہی تھی مگر اب......

اب اپنے شریک حیات کے ساتھ جو زندگی کے تصورات و خیالات سے کافی دور تھی ویسی ہی زندگی بسر کر رہی تھی۔ انجانوں اور اجنبیوں کی طرح۔

اچانک گیٹ پر ہارن کی آواز سن کر وہ دوبارہ اپنے حال میں پہنچ گئی۔ ایک بڑی سی کالی گاڑی گھر کے کشادہ گیٹ سے اندر داخل ہوئی اس کار میں سے ایک جاذب نظر شخص اترا جو ثمین کا رفیق حیات تھا۔ اس کی شکل دیکھ کر اسے ہمیشہ ماضی یاد آتا تابش کی دوستی اور وہ خوف زدہ کرنے والی کالی رات یاد آتی۔

'شام ہو گئی ہے تم یہاں اکیلی ٹہل رہی ہو امی کہاں ہیں؟'

تابش نے اپنی ماں کی فکر میں دو جملے کہہ دیے۔

'جی وہ کمرے میں آرام کر رہی ہیں'

یہ سن کر تابش دفتر کی کچھ فائلیں ہاتھ میں لیے اندر چلا گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے چاروں طرف اندھیرا چھا گیا اور ان تاریکیوں کو چیرتی ہوئی چاند کی خوبصورت کرنیں سارے جہاں میں روشنی پھیلانے لگی۔ حسب معمول تابش، ثمین اور تابش کی والدہ نے رات کا کھانا کھایا۔ تابش نے اپنی ماں کی طبیعت پوچھی اور دوسرے روز ڈاکٹر کے یہاں چکر لگانے کا کہہ کر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ معمول کے مطابق ثمین اپنے کمرے میں اکیلی تھی اور تابش اسٹڈی میں دیر کام کرنے کا عادی بندہ تھا۔ ثمین کچھ نہیں سوچنا چاہتی مگر نا جانے کیوں وہ ماضی کی یادیں اس کے ذہن میں بار بار گردش کر رہی تھیں۔

ایک سال قبل ثمین، تابش اور دیبا کالج میں ساتھ پڑھا کرتے تھے۔ ثمین اور دیبا جگری سہیلیاں تھیں۔ دیبا بے حد خوبصورت اور اونچے گھرانے کی اکلوتی بیٹی تھی اور بہت ہونہار تھی۔ تابش، ثمین اور دیبا ایک ہی کلاس میں زیر تعلیم تھے۔ ثمین تابش کے بارے میں اتنا نہیں جانتی تھی مگر دیبا اور تابش ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے حال ہی میں اپنی محبت کا خلاصہ اپنے والدین کے سامنے کر دیا تھا۔ تابش کی والدہ کو ثمین بہت پسند تھی مگر اپنے اکلوتے بیٹے کی خواہش کے آگے وہ مجبور تھیں۔ سب کچھ بالکل ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا۔ ایک رات زوروں کی بارش ہو رہی تھی۔ چاروں طرف اندھیرا چھایا ہوا تھا ثمین اپنے کمرے میں پڑھائی کر رہی تھی کہ اچانک موبائل بجنے کی آواز آئی۔ نامعلوم نمبر دیکھ کر فون نہ اٹھایا مگر وہ بار بار بج رہا تھا اور عجب قسم کا خلل پیدا کر رہا تھا۔ مجبوراً فون اٹھا لیا فون پر تابش تھا اور پریشانی کی حالت میں بیان کر رہا تھا۔

'ثمین میں تمھارے گھر کے باہر کھڑا ہوں جلد از جلد آ جاؤ'

ثمین نے کمرے کی کھڑکی سے باہر نظریں دوڑائی ایک کالی گاڑی تیز بارش کی بوندوں کو چیرتی ان کا راستہ کاٹتے ہوئے بیچ سڑک پر کھڑی تھی۔ وہ لمبے لمبے قدموں سے چھاتا ہاتھ میں لیے نیچے آئی اور کار میں بیٹھ گئی۔ تابش نے کار ایک بڑے سے اسپتال کے آگے لا کر روک دی اور ثمین سے کہا۔

'دیبا کا بہت برا کار ایکسیڈنٹ ہوا ہے اور وہ اس اسپتال میں ہے میں نے سوچا تمھیں اطلاع کر کے یہاں لے آؤں اس کی والدہ بہت اکیلا پن محسوس کر رہی ہیں۔'

یہ سن کر ثمین بھاگی بھاگی اسپتال میں داخل ہوئی جہاں معلوم ہوا کہ دیبا کی حالت بہت نازک ہے اور اس حالت کی وجہ حادثہ کے ساتھ ساتھ یہ بھی تھی کہ وہ ماں بننے والی تھی اور اسی سبب ڈاکٹر بہت کوششوں کے بعد بھی اسے بچا نہ سکے۔ اس خبر سے دیبا کے والد کو بہت صدمہ پہنچا اور انھوں نے تابش کی طرف افسوس بھری نگاہوں سے دیکھا۔

'زندگی میں بہت بڑی غلطی ہوئی تم جیسے شخص پر بھروسہ کیا۔ میں نے اپنی بیٹی کھو دی ہے اس سے پہلے کوئی اپنا بیٹا کھو دے تم یہاں سے چلے جاؤ تابش'

تابش نے بہت کوشش کی اپنے با اخلاق اور صاف کردار ہونے کی مگر اس رات کسی نے اس کی بات نہ سنی سوائے بے عزتی کے کچھ ہاتھ نہ آیا۔ تابش نے ثمین سے شادی کر کے اپنی ماں کی آخری خواہش پوری کی ثمین اپنے ماما کے گھر رہتی تھی اس لیے اسے ہر فیصلہ آخری فیصلہ کے طور پر سنایا جاتا۔

ان ہی خیالوں میں گم ثمین اپنے کمرے میں کھڑکی کے قریب کھڑی تھی کہ یکلخت دروازہ کھلنے کی آواز آئی اور تابش کمرے میں داخل

ہوا۔'تم ابھی تک سوئی نہیں؟'

'نہیں دیبا کی یاد آگئی'۔

یہ سن کر تابش وہاں سے رخصت ہونے لگا ثمین نے اسے جاتا دیکھ کر کہا،' کیوں آپ کو دیبا یاد نہیں آتی، اس کی موت...... یہ سن کر تابش رک گیا اور کہنے لگا' افسوس کالج کے اتنے دن دوستی کے باوجود تم مجھے سمجھ نہ سکی میں اللہ سے دعا کروں گا کہ سچ تمھارے سامنے چل کر آئے' یہ کہہ کر وہ رخصت ہوا اور چاروں طرف سے اذانوں کی آوازیں آنے لگیں دیکھتے ہی دیکھتے چاروں طرف سورج کی سنہری کرنیں ایک مرتبہ پھر لوگوں کو بیدار کرنے لگیں۔

اپنے بیٹے کے کہنے پر تابش کی والدہ ثمین کے ساتھ اسپتال ڈاکٹر سے معائنہ کی غرض سے گئیں۔ ڈاکٹر نے انھیں مکمل طور پر آرام کرنے کا مشورہ دیا۔ ثمین اور تابش کی والدہ گھر واپس آئیں۔ ثمین نے اپنی ساس کو دوا دی اور کمرے میں سلا دیا۔ ثمین سارا دن فرصت کے اوقات میں ہی گزارتی۔ تابش بہت امیر گھرانے کا اکلوتا بیٹا تھا اور اسے یہ ساری دولت وراثت میں ملی تھی جسے وہ ہر وقت بلند وعروج پر پہنچانے میں مصروف رہتا ہے۔ ابھی دوپہر کا وقت تھا کہ اچانک دروازے پر گھنٹی کی آواز سنائی دی۔ ملازمہ نے دروازہ کھولا اور مہمان کو اندر بٹھا کر ثمین کو خبر دی۔ ثمین نے اس خاتون کو غور سے دیکھا گٹھیلا بدن، جمے ہوئے بال اور جسم پر خوبصورت نقاشی کی ہوئی کالی رنگ کی ساڑھی مگر پہناوے میں جو پرفیک نیس جھلک رہی تھی وہ چہرے کے ہاؤ بھاؤ سے بالکل تضاد تھی۔ ماتھے پر بل اور بے رونق سا چہرہ۔

وہ خاتون ثمین کو آتا دیکھ اُٹھ کھڑی ہوئی اور فوراً بولی

'تم ثمین ہو دیبا کی جگری سہیلی، ہے نا؟'

'جی مگر میں نے آپ کو نہیں پہچانا'

وہ خاتون آگے بڑھ کر اپنا تعارف دینے لگی۔

'میں دیبا کی ممانی ہوں اور تم سے ضروری بات کرنے آئی ہوں۔'

یہ سن کر ثمین نے انھیں بٹھایا اور ان کے قریب بیٹھ گئی۔ خاتون نے بولنا شروع کیا۔

'میرا ایک بیٹا ہے ریحان، جو دیبا کو بہت پسند کرتا تھا اور اسے پانے کے لیے کچھ بھی کر گزرنے کو تیار تھا مگر دیبا کے والد صاحب نے ہمیں تابش کے بارے بتایا اور انکار کر دیا جس کی وجہ سے ریحان دن بہ دن پاگلوں سی حرکتیں کرنے لگا اور ایک رات موقع دیکھ کر اس نے دیبا کے ساتھ......' یہ جملہ کہتے ہوئے ان کی آنکھوں سے آنسوں گرنے لگے' اس نے پھول سی نازک بچی کے ساتھ بہت برا سلوک کیا جس کے نتیجے میں وہ لڑکی جس کا کوئی قصور نہ تھا بد کرداروں کی طرح مر گئی اور اس کی موت کی سزا آج میں اور میرے شوہر کاٹ رہے ہیں۔ ریحان مکمل طور پر ذہنی ہوش و حواس کھو چکا ہے۔ ہمارا اکلوتا بیٹا ہم سے چھن گیا۔ دیبا کی موت کے بعد اس کے والدین یہ ملک چھوڑ کر چلے گئے مجھے آج تم آخری امید کی طرح اسپتال میں نظر آ گئی میں نے سوچا دیبا تمھارے بہت قریب تھی شاید تم ہمارے بیٹے کو معاف کر دو تو دیبا بھی معاف کر دے'۔

وہ خاتون ثمین کے سامنے آنسوؤں سے تر چہرہ لیے دونوں ہاتھوں کو جوڑتے گناہگاروں کی طرح بیٹھی تھی۔ ثمین کو تابش کے ساتھ کی گئی ہر بے عزتی یاد آنے لگی وہ سارے کڑوے جملے الزام تراشی اور تابش کو شوہر کے درجے سے محروم رکھنا۔ ثمین نے اسے اپنے شوہر کا مقام نہیں دیا تھا۔ اسے وہ خطرناک رات یاد آئی جب تابش ہر کسی کے سامنے اپنے گناہگار نہ ہونے کی وضاحتیں پیش کرتا رہا مگر کسی نے اس کی ان وضاحتوں اور صفائیوں کی جانب دھیان نہیں دیا۔ اپنے ذہن کو اس کی جانب سے خراب کرتے رہے اور آج ایک سال کے بعد ثمین کے سامنے آخر سچ خود چل کر آ گیا۔

ثمین نے دیبا کی ممانی جان کو معاف کر دیا کیونکہ اسے اس کے ماما نے سکھایا تھا کہ معاف کرنا بڑی دولت ہے اس خاتون کے روانہ ہونے کے بعد ثمین بہت بے چین تھی۔

ہر روز شام اتنی جلد ہو جایا کرتی ہے مگر آج...... آج دن ہی نہیں کٹ رہا۔

خدا خدا کر کے شام ہوئی اور تابش حسب معمول سے ذرا دیر پر گھر لوٹا اپنی ماں کی خیریت دریافت کرنے کے بعد اپنے کمرے میں داخل ہوا جہاں ثمین اس کا بے صبری سے انتظار کر رہی تھی۔ اسے کمرے میں داخل ہوتا دیکھ کر وہ اٹھ کر کھڑی ہوئی۔ تابش نے ثمین کے رویے میں بے چینی دیکھ کر پوچھا۔

'کیا ہوا؟'

ثمین دو قدم آگے بڑھ کر بولی آج دیبا کی ممانی آئی تھیں اور ......اور وہ۔ تابش مسکرانے لگا اور ثمین کا جملہ مکمل کرتے ہوئے بولا۔

'اور تمھیں ریحان کے بارے میں معلوم ہو گیا'۔

ثمین نے حیرانگی سے تابش کی طرف دیکھا۔ تابش نے اپنی رضا میں سر ہلایا آگے بڑھ کر ثمین کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر کہا۔

'مجھے معلوم نہ تھا کہ میری دعا میں اتنا اثر ہے'۔□□□

Unzela Ansari
65, Mahada Colony
Near Arqam Masjid
Malegaon (Nasik)-423203 (MS)

حسن سخن

ماہ لقا چندہ

غزل

تم منہ لگا کے غیروں کو مغرور مت کرو
لگ چلنا ایسے ویسوں سے دستور مت کرو

ٹسوے بہا کے ہر گھڑی زاری نہیں ہے خوب
یہ راز عشق ہے اسے مشہور مت کرو

ہر چند دل دکھانا کسی کا برا ہے پر
رنجیدہ خاطروں کو تو رنجور مت کرو

اے ہمدمو جو مجھ سے ہے منظور اختلاط
جز ذکر یار تم کوئی مذکور مت کرو

روشن رکھو جہاں میں مولا مثال مہر
چندہ کے منہ سے نور کو تم دور مت کرو

بلقیس ظفیر الحسن

غزل

کب ایک رنگ میں دنیا کا حال ٹھہرا ہے
خوشی رکی ہے نا کوئی ملال ٹھہرا ہے

تڑپ رہے ہیں پڑے روز و شب میں الجھے لوگ
نفس نفس کوئی پیچیدہ جال ٹھہرا ہے

خود اپنی فکر اگاتی ہے وہم کے کانٹے
الجھ الجھ کے مرا ہر سوال ٹھہرا ہے

بس اک کھنڈر مرے اندر جئے ہی جاتا ہے
عجیب حال ہے ماضی میں حال ٹھہرا ہے

کبھی نہیں تھا نہ اب ہے خیال سود و زیاں
وہی تو ہوگا جو اپنا مآل ٹھہرا ہے

اس اک بات کو گزرے زمانہ بہت گیا
مگر دلو ں میں ابھی تک ملال ٹھہرا ہے

غزلیں

ڈاکٹر مینا نقوی

جب گھری کشتی مری وقتِ سفر طوفان میں
دے گیا دریا بھی کچھ گرداب مجھ کو دان میں

یوں کتاب عشق کی تحریر یکسر مٹ گئی
تولی جاتی ہے وفا اب جھوٹ کی میزان میں

مرتکز کردار پر رہتی ہے دنیا کی نظر
ایک لمحہ چاہیے رسوائی کے اعلان میں

منتظر ہوں کس لیے اب میں کسی تعبیر کی
خواب جب دفنا دیے آنکھوں کے قبرستان میں

ہاتھ میں کاغذ قلم ہے ذہن میں کچھ بھی نہیں
اک اداسی بھر گئی ہے میرے جسم و جان میں

اس سے بچھڑے ایک مدت ہو گئی "مینا" مگر
اب تلک خوشبو بسی ہے روح کے گلدان میں

تیری خوشبو جہاں جہاں گزری
میری چاہت وہاں وہاں گزری

سبز پتے بھی زرد زرد ہوئے
موسمِ گل سے جب خزاں گزری

مجھ کو سورج کا خوف تھا ہی نہیں
زندگی زیرِ سائباں گزری

کس طرح سارے لوگ جان گئے
میرے تیرے جو درمیاں گزری

ننھے ننھے فرشتے ساتھ رہے
عمر اپنی تو شادماں گزری

پھول نے جب سے ساتھ چھوڑ دیا
خوشبو گلشن سے بے اماں گزری

ترک اس نے تعلقات کیے
یہ مصیبت بھی ناگہاں گزری

اس کو منزل سمجھ لیا جب سے
میرے رستوں سے کہکشاں گزری

لے کے آئی قبولیت کی گھڑی
جب دعا سوئے آسماں گزری

شاعری دل پہ نقش ہے "مینا"
ذہن پر ہو کے جاوداں گزری

Dr Meena Naqvi
A-301 Mahamaya Balika Inter College
Staff Campus
Sector-44
Noida-201301 (UP)

طلعت جہاں سروہہ

آؤ آؤ، اُٹھو مری بہنو!
یومِ تاسیس ہم مناتے ہیں

اُردو کے کارواں کو ساتھ لیے
ہم بھی آگے قدم بڑھاتے ہیں

ہم ہیں اردو زباں سے وابستہ
اردو ہی مادری زباں اپنی

اس کی آغوش میں یہ لگتا ہے
جیسے اردو زباں ہو ماں اپنی

قافلہ خسرو اور ولی کا یہ
میر، غالب و ذوق تھے جس میں

داغ ، اقبال، جوش بھی آئے
ہم بھی شامل ہوئے ہیں آج اس میں

اب اسی کاروانِ اردو کو
اور آگے تلک بڑھانا ہے

عہد کرتے ہیں آج سے اردو
کا علم ہاتھ میں اٹھانا ہے

اس حقیقت سے متفق ہیں سب
سب سے پیاری زبان ہے اردو

اس میں شائستگی کا جادو ہے
اک انوکھی زباں ہے اردو

ہم جو اردو میں بات کرتے ہیں
لفظوں سے اک مہک سی آتی ہے

اردو کے ایک ایک جملے میں
شمع تہذیب جگمگاتی ہے

ہے یہ اردو زباں ہماری ماں
ماں کہاں نفرتیں سکھاتی ہے

گود میں لے کے یہ ہمیں اپنی
پیار کے گیت گنگناتی ہے

میرا پیغام ہے مری بہنو!
ہم سب اردو کا احترام کریں

جس میں اردو کی ہو بقا شامل
آؤ ہم بھی کچھ ایسے کام کریں

Talat Jahan Saroha
12/944 Daud Sarai
Saharanpur-247001(U.P)

کریم آلو

اجزا: آلو آدھ کلو، ہری پیاز دو عدد، میدہ چار کھانے کے چمچے، ووسٹر سوس دو کھانے کے چمچے، فریش کریم چار کھانے کے چمچے، نمک حسب ذائقہ، پسی کالی مرچ چوتھائی چائے کا چمچ، پسی سفید مرچ چوتھائی چائے کا چمچ، دودھ دو کپ

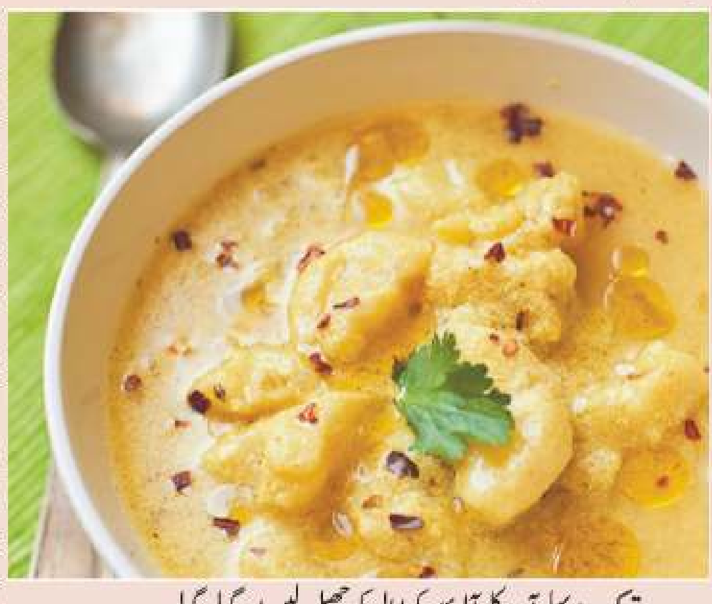

ترکیب: پہلے آدھ کلو آلوؤں کو ابال کر چھیل لیں اور گول گول کاٹیں۔ اب پین میں میدہ شامل کر کے بھون لیں پھر اس میں دودھ شامل کریں اور گرم کرلیں۔ دودھ جب اچھی طرح سے گاڑھا ہو جائے تو اس میں ہری پیاز، ووسٹر سوس، فریش کریم، نمک، پسی کالی مرچ، سفید مرچ ڈال کر مکس کریں۔ اب اس میں کٹے ہوئے آلو کے قتلوں کو شامل کر دیں اور چار سے پانچ منٹ پکائیں تیار ہونے کے بعد گرم گرم سرو کریں۔

شیر مال

اجزا: کھویا آدھا کپ، خمیر دو چائے کے چمچے، کیوڑا ایک چائے کا چمچ، گھی تین کھانے کے چمچے، کریم تین کھانے کے چمچے، انڈا ایک عدد، فل کریم ملک پاؤڈر چار کھانے کے چمچے، نیم گرم پانی ڈو بنانے کے لیے، تل حسب ضرورت

ترکیب: ایک پیالے میں دو کپ میدہ تین چوتھائی چائے کا چمچ نمک ایک کھانے کا چمچ کاسٹر شوگر، آدھا کپ کھویا، دو چائے کے چمچے خمیر، ایک چائے کا چمچ کیوڑا، تین کھانے کے چمچے گھی، تین کھانے کے چمچے کریم، ایک عدد انڈا اور چار کھانے کے چمچے فل کریم ملک پاؤڈر ڈال کر اچھی طرح مکس کر لیں۔ اب نیم گرم پانی سے گوندھ کر نرم ڈو بنا لیں اور تھوڑی دیر پھولنے کے لیے رکھ دیں، یہاں تک کہ وہ ڈبل ہو جائے۔ اب اسے مزید گوندھ کر اس کے تین سے چار پیڑے بنا لیں۔ پھر ہاتھ سے پھیلا کر کوارٹر سائز پلیٹ کے

برابر پھیلا دیں۔ اس کے بعد ٹرے پر ڈو ڈال کر کانٹے کی مدد سے نشان لگائیں اور 45 منٹ کے لیے چھوڑ دیں۔ اب اسے دودھ کے ساتھ برش کر کے حسب ضرورت تل چھڑک دیں۔ پھر اسے بارہ سے پندرہ منٹ کے لیے 200c پر بیک کریں۔ پھر آخر میں دودھ سے برش کر کے فوائل سے کور کریں، کھانے کے وقت سرو کریں۔

پنجابی کڑھی

اجزا: دہی 2/1 کلو، چھاج 2/1 لیٹر، بیسن 250 گرام، ہلدی 1 چائے کا چمچ، نمک 1 چائے کا چمچ، کٹی لال مرچ 1 کھانے کا چمچ، میتھی دانہ 1 کھانے کا چمچ

تڑکا لگانے کے اجزا: لہسن کے جوے 6 عدد، گول مرچ 6 عدد، کڑھی پتے 6 عدد، تیل 2/1 کپ، زیرہ 1 چائے کا چمچ

پکوڑے بنانے کے اجزا: بیسن 250 گرام، کٹی پیاز 1 عدد، زیرہ 1 چائے کا چمچ، پسی لال مرچ 1 چائے کا چمچ، نمک 2/1 چائے کا چمچ، تیل حسب ضرورت

ترکیب: 2/1 کپ میں تیل گرم کر کے 1 کھانے کا چمچ میتھی دانہ ڈال دیں۔ جب خوشبو آنے لگے تو اس میں کٹی لال مرچ، ہلدی اور نمک ڈال کر بھونیں۔ پھر آدھا لیٹر چھاج اور 250 گرام بیسن اچھی طرح پھینٹ لیں۔ اور ڈش میں ڈال کر آدھے گھنٹے تک ہلکی آنچ پر پکنے دیں۔ اب پکوڑے بنانے کے لیے 250 گرام بیسن، ایک چائے کا چمچ زیرہ، ایک چائے کا چمچ پسی لال مرچ، آدھا چائے کا چمچ نمک اور ایک عدد کٹی پیاز کے پکوڑے بنا کر تیل میں تل لیں۔ جب کڑھی پک جائے تو اس میں بنائے ہوئے پکوڑے ڈالیں آخر میں آدھا کپ تیل گرم کر کے 6 عدد لہسن کے جوے، 6 عدد گول مرچ، ایک چھوٹا چمچ زیرہ 6 عدد کڑھی پتوں کو فرائی کریں اور کڑھی پر ڈال کر پیش کریں۔ **(بحوالہ ہماری ویب)**

بھنڈی کے دہی بڑے

اجزا: دہی آدھا کلو، بھنڈیاں آدھا کلو، بیسن آدھا پاؤ، ہری مرچ چھ عدد، نمک حسب ذائقہ، لہسن دو جوے، سفید زیرہ آدھا چائے کا چمچ، تیل فرائی کرنے کے لیے

ترکیب: دہی کو اچھی طرح پھینٹ لیں پھر اس میں ہری مرچیں، زیرہ اور لہسن پیس کر شامل کریں اور نمک بھی ڈال کر الگ رکھ لیں۔ بیسن میں نمک مرچ ملا کر پکوڑوں کی طرح گھول لیں۔ بھنڈیوں کو اچھی طرح دھو لیں اور لمبائی میں کٹ لگا کر ہوا میں خشک کر لیں۔ کڑاہی میں آئل گرم کر کے بھنڈیوں کو باری باری بیسن میں ڈبو کر ڈیپ فرائی کر لیں اور دہی میں ڈال دیں۔ آخر میں زیرے کا بگھار لگائیں۔ ذائقے دار بھنڈی کے دہی بڑے تیار ہیں۔ **(بحوالہ: www.khanapakana.com)**

زیکا وائرس

نسیم سعید

پہلی بار 1947 میں زیکا وائرس افریقی ملک یوگانڈہ کے بندروں میں پایا گیا تھا۔ انسانوں میں پہلی بار یہ وائرس 1954 میں نائیجیریا میں پایا گیا تھا۔ اس کے بعد افریقہ، جنوبی مشرقی ایشیا اور بحرالکاہل کے کئی جزیروں میں لوگ اس کا شکار ہوئے۔ یہ تغیر بہت چھوٹے پیمانے پر ہوا تھا۔ اس وجہ سے یہ انسانوں کے لیے بڑا خطرہ تسلیم نہیں کیا جاتا تھا۔ سال 1947 کے بعد کی دہائیوں میں اس کے بے حد کم معاملے سامنے آئے تھے۔ اس بنا پر سائنسدانوں نے اسے سنجیدگی سے قبول نہیں کیا تھا۔ سال 2013 کے بعد خاص کر سال 2015 میں اس طرح کے کئی حادثات رونما ہوئے۔ برازیل کی ایک بہت بڑی آبادی اس کی زد میں آنے لگی۔ اس کے بعد سے ہی یہ وائرس دنیا کے کئی ملکوں میں پھیل گیا۔ اسے اب وبا کے طور پر پھیلنے کا اندیشہ ظاہر کیا جا رہا ہے۔ اس وجہ سے ریو اولمپک میں زیکا وائرس سے لڑنے کے لیے بے تحاشہ روپے خرچ ہوئے تھے۔ عالمی صحت تنظیم (WHO) نے زیکا وائرس کا ایک Global public health emergency کے طور پر اعلان کیا ہے۔

معلوم ہوا کہ یہ وائرس مچھروں کی پینتیس انواع و اقسام سے پھیلتا ہے۔ ان میں سے سات انواع اکیلے امریکہ میں پائی جاتی ہیں۔ جارجیا یونیورسٹی کی تحقیق میں اس بات کا خلاصہ ہوا ہے۔ شروعات میں یہ مانا جاتا تھا کہ یہ بیماری فلوریڈا میں بہت زیادہ تعداد میں پائے جانے والے aedes aegypti یا aedes albopictus نامی مچھروں سے پھیلتی ہے۔ جارجیا یونیورسٹی کے ماہر ماحولیات نے تصدیق کی ہے کہ یہ آئرلینڈ میں 2007 میں

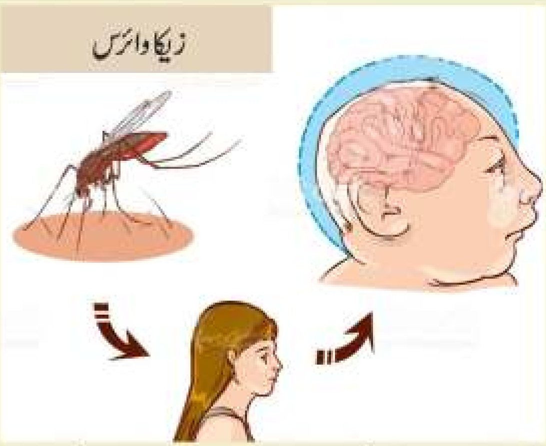

مختلف انواع واقسام کے مچھروں میں پایا جاتا ہے۔ سائنسدانوں کا کہنا ہے کہ عام طور پر اب بھی یہ وائرس aedes مچھر سے ہی پھیلتا ہے۔ ان ہی مچھروں سے ڈینگو اور چکن گنیا کے وائرس پھیلتے ہیں۔ aedes مچھر پورے ایشیا میں پائے جاتے ہیں۔ کناڈا اور چلی کے سرد علاقوں کو چھوڑ کر یہ شمالی او رجنوبی امریکہ کے کم و بیش تمام ممالک میں پائے جاتے ہیں۔

زیکا وائرس کا شکار زیادہ تر حاملہ خواتین ہوتی ہیں۔ ان کے بچے غیر نشوونما یافتہ دماغ کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں۔ سب سے پہلے لاطینی امریکی ممالک میں اس بیماری کا پتہ چلا تھا۔ اس بیماری کی وبائی صورت میں برازیل کی کئی ریاستوں میں ایمرجنسی کا اعلان بھی کر دیا گیا تھا۔ اسی سبب دوسرے ممالک کے لوگوں نے یہاں کے باشندوں کو صلاح دی تھی کہ وہ حمل ٹھہرنے

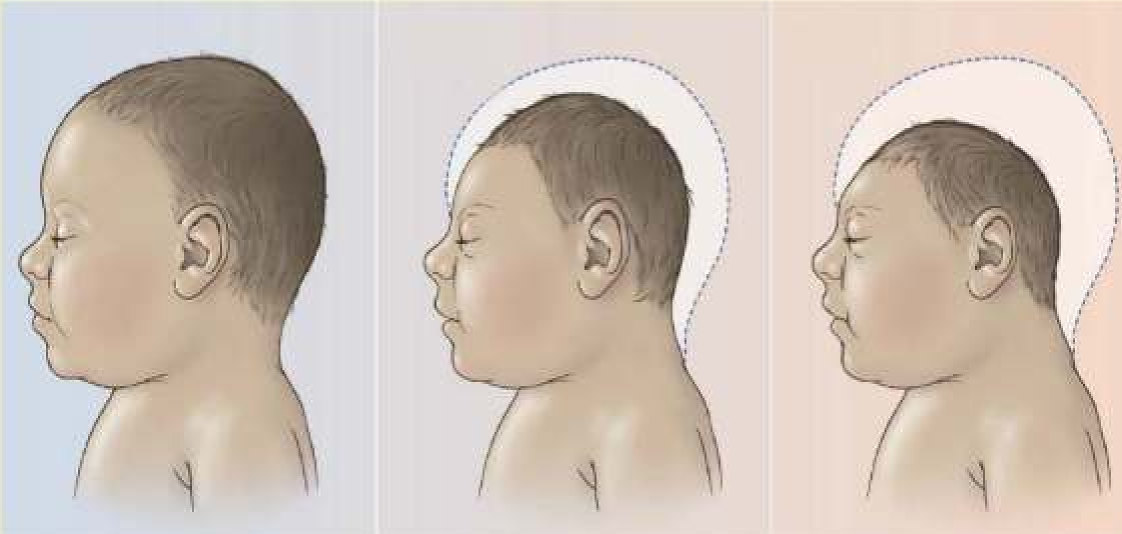

Microcephaly سے شدید طور پر متاثرہ بچہ | Microcephaly سے متاثرہ بچہ | نارمل بچہ

سے احتیاط برتیں۔ کیونکہ آنے والی نسلیں اس مرض کا شکار ہو سکتی ہیں۔ حالانکہ زیکا وائرس جان لیوا نہیں ہوتا ہے۔ پھر بھی اس کے شکار مریضوں میں پانچ میں سے ایک کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ فی الحال اس وائرس کا کوئی ٹھوس علاج دریافت نہیں ہوا ہے۔ اس کا کوئی مدافعتی ٹیکہ اور دوا بھی دستیاب نہیں ہے۔ یہ وائرس پیٹ میں نشوونما پاتے بچوں کو Microcephaly نامی بیماری میں مبتلا کر دیتے ہیں۔

Microcephaly عام طور پر بچوں میں ہونے والی بیماری ہے۔ اس کی وجہ سے بچوں کے سر کی جسامت چھوٹی ہو جاتی ہے۔ دماغ کی پوری طریقے سے نشوونما نہیں ہو پاتی۔ جب پیدائش کے وقت بچے کے سر کی پیائش 31.5 سم سے 32 سم سے بھی کم ہو تو اسے Microcephaly نامی مرض کا شکار تسلیم کیا جاتا ہے۔ امریکہ میں ہر سال اوسطاً 25 ہزار بچے اس بیماری کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں۔ کئی دفعہ یہ بیماری جان لیوا بھی ہوتی ہے۔ کیونکہ کئی بچوں کا دماغ زندگی جینے کے لیے ضروری افعال انجام نہیں دے پاتے ہیں۔ Microcephaly ہونے کا سبب روبیلا وائرس (Rubella Virus) کی تبدیلی بھی ہو سکتی ہے۔ حمل کے دوران وراثتی بیماریوں کی وجہ سے بھی یہ بیماری ہو سکتی ہے۔ زیکا وائرس کے شکار انسانوں میں ہلکا بخار، سرخ اور دکھتی ہوئی آنکھیں، سر درد اور جوڑوں میں درد جیسی شکایت ہو جاتی ہے۔ یہ اصل میں بہت کم ہونے والی نظامِ اعصاب کی بیماری ہے۔ اسے سائنسداں Guillain-barre Syndrome کے نام سے بھی جانتے ہیں۔ اس کی وجہ سے عارضی طور پر لقوی بھی مار دیتا ہے۔

جس طرح سے ڈینگو اور چکن گنیا کی جانچ کی جاتی ہے اسی طرح زیکا وائرس کی بھی جانچ ہوتی ہے۔ خون کی جانچ کے ذریعے یہ ممکن ہے۔ اگر کوئی انسان اس مرض سے متاثر ملک سے آیا ہے اور اسے بخار یا کوئی دوسری علامت دکھائی دے تو فوراً اُس کی جانچ کرانا ضروری ہے۔ زیکا وائرس کے خاتمہ کا ٹیکہ ایجاد کرنے میں آج دُنیا کے تمام ممالک کے سائنسداں حتی الامکان کوشش کر رہے ہیں۔

امریکہ کا صحت کا قومی ادارہ (National Institute of Health of America) کا کہنا ہے کہ زیکا ٹیکہ کا ٹرائل شروع ہے۔ ممکن ہے یہ ٹیکہ جلد میں دستیاب ہو جائے گا۔ اسی طرح برازیل میں اس وائرس کی جانچ کے لیے ایک Kit تیار کی جا رہی ہے۔ اس سے وائرس کے شکار ہونے والے مریضوں کی جلد ہی شناخت ممکن ہے۔ Aedes مچھروں کو مارنے کے طریقے بھی ڈھونڈ نکالنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ حیدر آباد میں Bharat Biotech International Limited نے بھی زیکا وائرس کا ٹیکہ تیار کرنے کی سمت میں آگے قدم بڑھایا ہے۔ یہ کمپنی زیکا ٹیکہ بنانے والی دنیا کی شاید پہلی کمپنی ہوگی۔ یہ ایک Pharmaceutical and Biotech کمپنی ہے۔

□□□

Naseem Sayeed

Teacher

M.M. Rabbani High Shcool

Kamptee-441102 (M.S)

حسن کی نگہداشت

سردیوں میں جلد کی حفاظت

نارمل، خشک چکنی اور کمبینیشن جلد نارمل جلد نہ ہی زیادہ چکنی ہوتی ہے اور نہ ہی زیادہ خشک۔ خشک جلد کھردری اور بے رونق ہوتی ہے اس کی لیئر موٹی، چہرہ کے مسامات کھلے ہوئے اور چہرے پر لکیریں ہوتی ہیں ایسی جلد پر جھریاں جلدی آجاتی ہیں چکنی جلد زیادہ تر لوگ پسند کرتے ہیں حقیقتاً یہ آئیڈیل جلد ہوتی ہے۔

☆ اگر آپ کی جلد چکنی ہے تو صبح اٹھ کر آئینے کے سامنے جا کر کاٹن یا ٹشو کو گرم پانی میں گیلا کریں اور بلیک ہیڈز صاف کرلیں یہ آسان حل ہے۔

☆ کھانے کا سوڈا عرق گلاب میں مکس کر کے ناک پر لگالیں انگلیوں کے پوروں سے ہلکے ہلکے مساج کریں اور پانچ منٹ بعد دھولیں متاثرہ جگہ چمک اٹھے گی منہ دھونے کے بعد ٹونر ضرور استعمال کریں اس کے لیے عرق گلاب بھی بہتر رہے گا اس کا اسپرے استعمال کریں۔

☆ فیشل کے دوران ماسک صاف کرنے کے لیے اسفنج کا استعمال بالکل نہ کریں یہ چہرے کے لیے مضر ہوتا ہے اسفنج کے چھوٹے چھوٹے پورس میں بیٹھی ہوئی گندگی آپ کے چہرے کو نقصان پہنچا سکتی ہے جو چہرے پر دانوں کا سبب بنتی ہے۔ اسفنج کی جگہ کاٹن استعمال کریں۔

چہرے پر اسکرب، بیسن، ملتانی مٹی، جو کا آٹا ابٹن مٹی، بیسن یا ابٹن وغیرہ صاف کرتے وقت پہلے چہرہ پانی کے چھینٹوں سے ہلکا ہلکا گیلا کرلیں پھر گیلے ٹشو کو عرق گلاب میں بھگو کر ہلکے ہاتھوں سے پونچھیں لیکن رگڑیں بالکل نہیں۔

رنگت نکھارنے کے لیے

لیموں اور ہلدی کا پیسٹ بنا کر چہرے پر لگانے سے رنگت نکھرتی ہے۔ دس منٹ کے بعد ہلکے ہاتھوں سے مساج کر کے چہرے سے اس کو اتارلیں اور صاف پانی سے چہرے کو دھولیں۔

رات کو سونے سے پہلے اصلی شہد اور بالائی باہم ملا کر چہرے پر لگائیں اس سے چہرے کے داغ دھبے اور دانے بھی ہلکے ہو جاتے ہیں اور رنگت بھی نکھرتی ہے۔

لیموں کا رس ایک تولہ، روغن زیتون دو تولہ اور روغن بادام دو تولہ۔ تینوں آمیزوں کو رات کو سوتے وقت چہرے اور بازوؤں پر ملیں چند دنوں میں رنگت نکھر جائے گی۔ (tazablog.com)

عمدہ گھریلو ابٹن بنایئے

اجزا: گیہوں کا آٹا: آدھ پاؤ، بیسن آدھ پاؤ، ہلدی ایک تولہ

ترکیب: سب اشیا کو باریک پیس کر آٹے میں ملا لیں اور کسی کھلے منہ کی شیشی میں رکھ دیں۔ ہر روز تھوڑا سا یہ اُبٹن لے کر پانی یا دودھ میں شامل کر کے لئی سی بنا لیں اور چکنائی کے لیے سرسوں کا تیل یا بالائی شامل کر لیں اور پندرہ منٹ تک خوب ملیں۔

دورانِ خون کی تیزی سے آپ کا چہرہ تمتما اٹھے گا 2 ہفتے بعد آپ اپنے چہرے میں حیرت انگیز تبدیلی پائیں گے اور کسی کریم کے استعمال کی ضرورت بھی نہیں رہے گی۔

کیل مہاسے اور ان کا گھریلو علاج

بلوغت کی عمر سے لے کر تقریباً 29 سال تک مہاسے نکلنے کی شکایت ہو سکتی ہے۔ اس عمر میں ہارمونل نظام میں تبدیلی کے باعث کیل مہاسے نکلتے ہیں اور ختم ہونے کے بعد بھی چہرے پر نشان رہ جاتے ہیں۔ جب کیل مہاسے نکلنا شروع ہو جائیں تو خوراک میں تبدیلی لانی چاہیے۔ چکنائی اور مصالحے والی اشیا ترک کر دینا چاہیے۔ مہاسوں میں کمی کرنے یا ان کے نشانات ختم کرنے کے متعدد طریقے ہیں۔ دودھ میں ایک چمچ گندھک ملائیں اور اس دودھ کو رات کو سونے سے قبل چہرے پر لگا لیں، صبح اٹھ کر ایک گلاس دودھ میں ایک گلاس پانی ملائیں اور اس سے چہرے کو دھو لیں۔ کچھ دیر بعد ٹھنڈے پانی سے منہ دھو لیں، ایک ہفتہ یہ طریقہ آزمانے سے مہاسے وغیرہ ختم ہو جائیں گے۔

درمیانے سائز کا ایک سیب لے کر اسے کدوکش کر لیں۔ آرام سے بستر پر لیٹ جائیں اور پھر کدوکش کیا ہوا سیب چہرے پر پھیلا لیں اور تقریباً بیس منٹ تک ایسے ہی لیٹی رہیں اور پھر تازہ پانی سے منہ دھو لیں۔ اس عمل سے نہ صرف جلد کی چکنائی صاف ہو گی بلکہ مسام بھی کھل جائیں گے۔

جلد کی حفاظت کے گھریلو نسخے

خواتین اپنی خوبصورتی کو بڑھانے کے لیے پارلر کا رخ کرتی ہیں مگر اکثر اوقات وہ اتنی مصروف ہوتی ہیں کہ پارلر جانا انتہائی مشکل ہوتا ہے۔ جس سے خواتین کی خوبصورتی ماند پڑ جاتی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ وہ گھر پر ہی گھریلو نسخے سے اپنی خوبصورتی بڑھا سکتی ہیں۔ بس تھوڑی سی محنت کی ضرورت ہوتی ہے۔ خشک جلد کے لیے زیتون کا تیل، عرق گلاب اور لیموں کا عرق ملا لیں۔ اب اس مکسچر کو استعمال کریں۔ آپ کی جلد کی خشکی ختم ہو جائے گی۔

- ملتانی مٹی، گلاب کا عرق، ہلدی، کھیرے اور لیموں کا رس ملا کے چہرے پر لگائیں۔ اس سے چہرے کی جھریاں ختم ہو جائیں گی اور چہرہ بارونق ہو جائے گا۔
- پانی میں گاجر ابال کر اس پانی سے بھاپ لینے سے رنگت نکھرتی ہے۔
- چہرے کے گڑھے دور کرنے کے لیے ملتانی مٹی میں عرق گلاب ملا کر چہرے پر تقریباً پندرہ منٹ کے لیے لگائیں۔ سوکھ جانے کے بعد تازے پانی سے منہ دھو لیں۔
- چرونجی میں دودھ ملا کر پیس لیں چہرے پر لگائیں اس سے رنگت نکھرتی ہے۔
- ایک چمچ دہی میں چند قطرے لیموں کا رس ملا کر رات کو کریم کے طور پر لگائیں اس کے استعمال سے رنگت میں نکھار آتا ہے۔
- شہد میں ایک لیموں کا رس ملا کر چہرے پر لیپ لگائیں پندرہ منٹ بعد منھ دھو لیں مسام بند ہو جائیں گے۔
- شہد اور خوبانی کا گودا چہرے پر لگانے سے رنگت نکھرتی ہے اور رواں بھی صاف ہوتا ہے۔ (blogspot.com)

تاثرات: نگر نگر سے

''ماہنامہ خواتین دنیا'' جیسے ہی دستیاب ہوا، اسے دیکھنے کا تجسس دوبالا ہوگیا۔ لفافے سے الگ کرتے ہی تین مسکراتی ہندوستان کی عظیم ہستیاں سامنے تھیں۔ اکتوبر کا مہینہ ادبی، سیاسی اور سماجی کئی اعتبار سے انتہائی اہم ہے۔ اس مہینے میں مختلف شعبوں میں لافانی شخصیتیں پیدا ہوئیں ''خواتین دنیا'' بھی اس رنگ میں رنگی نظر آئی۔ رسالے کے کور پیج پر مہاتما گاندھی، سرسید اور اے۔ پی۔ جے۔ عبدالکلام کی خوبصورت تصویر نظر آئی۔ ہر بار کی طرح یہ شمارہ بھی قابل غور رہا۔ ان تینوں شخصیات کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر تسنیم بانو نے اہم تعارفی و معلوماتی مضمون لکھا۔ اس مضمون میں ان تینوں شخصیات کے کارناموں پر بھرپور روشنی ڈالی گئی ہے۔ مہاتما گاندھی پر اس شمارے میں امریتا کماری پانڈے اور فرحت زیبا صاحبہ نے بھی عمدہ مضمون لکھا لیکن کہیں نہ کہیں عبدالکلام اور سرسید کی کمی کا احساس ہوتا رہا۔ لیکن اس کمی کی بھوک مٹانے کے لیے لذیذ پکوان کے چٹ پٹے سواد سے بھری ذائقے دار پوری، پھینی، اور مصالحے دار چاٹ نے کچن کو مہکا دیا۔

مجموعی طور پر ''خواتین دنیا'' کا یہ شمارہ بھی انتہائی اہم اور معلوماتی رہا، جسے پڑھ کر ہر بار کی طرح دلی مسرت حاصل ہوئی۔ ''خواتین دنیا'' صرف ایک رسالہ نہیں بلکہ یہ ہر اس عورت کے لیے ایک وسیع پلیٹ فارم ہے جہاں سے وہ اپنے قلبی واردات، جذبات، احساسات اور اپنی زندگی کے تجربات کی ترجمانی کرسکتی ہے اور اپنی آواز عوام تک پہنچا سکتی ہے۔

صالحہ صدیقی، ریسرچ اسکالر، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

ماہنامہ 'خواتین دنیا' کا نومبر 2018 کا شمارہ میرے ہاتھوں میں آیا۔ قومی کونسل کی یہ کوشش ہم خواتین کے لیے کسی تحفے سے کم نہیں ہے۔ ماہنامہ 'خواتین دنیا' دیدہ زیب سرورق اور اعلیٰ طباعت کا نمونہ ہے۔ ماہنامہ میں خواتین سے متعلق کئی موضوعات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ جس میں کچھ اہمیت کے حامل ہیں تو کچھ توجہ طلب۔ میرے سامنے چونکہ نومبر کا شمارہ ہے اور اس میں جہان نسواں کے ذیل میں جن مضامین کو جگہ دی گئی ہے ان میں تقریباً سبھی ادبی نقطۂ نظر سے لکھے گئے ہیں۔ عمرانہ خاتون کا مضمون 'اردو زبان و ادب کی تعلیم اور خواتین' اور محترمہ نفیس بانو ہاشمی کا مضمون 'خواتین اور اردو اسکولوں میں سائنس: نصاب اور تعلیم' اہم اور توجہ طلب ہیں۔ مرزا غالبؔ پر رضیہ پروین کا مضمون بھی اچھا ہے۔ غزالہ فاطمہ اور نورالصباح نے اچھا تجزیہ کیا ہے۔ اس شمارے میں خواتین کے سماجی مسائل پر مضامین کی کمی کا احساس ہوتا ہے۔ عین ممکن ہے کہ اس کے پہلے کے شماروں میں اس کا اہتمام ہو۔ حالانکہ کہانیوں میں سماجی موضوعات ہیں جن میں درس بھی ہے اور نصیحت بھی۔ عصمت چغتائی کی کہانیاں کسی تعارف کی محتاج نہیں ہیں۔ کہانیوں میں سفینہ بیگم کی 'بلا عنوان' اچھی کہانی ہے۔ وہیں زینب النساء حیا کی کہانی 'قطرہ قطرہ دریا ہوتا ہے' درس دیتی ہوئی نظر آتی ہے۔ حسن سخن کے ذیل میں جہاں مشہور شاعرات پروین شاکر اور محترمہ انجم رہبر کی عمدہ غزلوں کے ساتھ نئی نسل کی شاعرات کے کلام کو شامل کیا گیا وہیں ڈاکٹر رؤف خیر کی نظم 'بیٹی بچاؤ' سنجیدہ ہونے کے ساتھ ایک طنز کا پہلو بھی رکھتی ہے۔ پکوان اور خواتین کی صحت کے موضوعات ماہنامے کی اہمیت میں چار چاند لگاتے ہیں۔ اس طرح دیکھا جائے تو 'خواتین دنیا' قومی کونسل کے ذریعہ ایک اچھی پیش رفت ہے۔

معصوم زہرا، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی

''خواتین دنیا'' ستمبر 2018 موصول ہوا۔ تمام پرچے پابندی سے مل رہے ہیں۔ سرورق پر ''موم کی گلیاں'' بانو قدسیہ کے ناولٹ کا

عکس دیا گیا ہے جس کا تجزیاتی مطالعہ مصنفہ عقیلہ نے پیش کیا ہے جسے پڑھنے کے بعد یہ تشریحی مطالعہ لگتا ہے۔ بہر حال اچھا لکھا گیا۔ روزمرہ زندگی کی مماثلت شہد کی مکھیوں سے کرنا ایک نادر تصور ہے اور قابل تعریف بھی۔

منتخب اشعار میں سنیتا رینا اور ڈاکٹر بھاؤنا کے اشعار فی الواقع بہت خوب ہیں۔ ویسے سعیدہ عروج، زبیدہ تحسین، شان معراج، مسعودہ حیات اور سیما نظمی کے اشعار بھی درحقیقت دل کو چھو لیتے ہیں۔ یقین جانئے کہ یہ مجلّہ تمام تر دیدہ زیب حسین و رنگین گلدستہ ہے جو نہ صرف آپ کی تنہائی کو معطر بلکہ جمالیات کی مہکتی تعبیر پیش کرے گا۔

مصطفٰی ندیم خان غوری، روضہ باغ، اورنگ آباد، مہاراشٹر

خواتین دنیا کا تازہ شمارہ حاصل ہوا ٹائٹل پیج بہت پسند آیا۔ مضامین کا انتخاب قابل تعریف ہے۔ اردو ادب کے فروغ میں خواتین کا اہم کردار رہا ہے اور موجودہ دور میں خواتین جو آج ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کر رہی ہیں اس میں دور اول کی خواتین کا اہم کردار رہا ہے۔ خصوصاً محمدی بیگم، رشیدۃ النساء اور نذر سجاد حیدر وغیرہ نے خواتین کے تخلیقی سفر کے لیے راہ ہموار کی۔ نذر سجاد حیدر کا ناول اختر النساء بیگم اردو کے ابتدائی ناولوں میں خاص اہمیت کا حامل ہے۔ اس لحاظ سے شگفتہ یاسمین کا 'نذر سجاد حیدر کے ناول اختر النساء کا تنقیدی جائزہ' اہم مضمون ہے۔ افسانے بھی اچھے ہیں۔ کوثر بیگ کا افسانہ 'عید کا دن' بڑے موثر انداز میں تحریر کیا گیا ہے۔ اس کا اثر تادیر رہتا ہے۔ 'سورج کی موت' میں بدلتے زمانے کی سلیقہ سے عکاسی کی گئی ہے۔

ڈاکٹر نشاں زیدی، غازی آباد، یوپی

رسالہ تو بہت عمدہ ہے۔ میرا افسانہ تین ماہ پہلے اس میں شائع ہو چکا ہے۔ ایک مضمون نوشی گیلانی پر بھی بھیجا تھا لیکن ابھی تک آیا نہیں۔

رسالے کی خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں گھریلو خواتین اور دیگر تمام خواتین کے لیے بہت کچھ ہے۔ ریسرچ اسکالر کے لیے بہت مفید اور چونکہ صرف خواتین کے لیے ہے اس لیے خواتین قلم کاروں کو بہت فیض پہنچا رہا ہے۔ اللہ کرے اس کی عمر دراز ہو۔

نصرت شمسی، رامپور

ماہنامہ خواتین کی دنیا ایک مقتدر ادبی رسالہ ہے جو فی الحقیقت طبقۂ نسواں کے فکری، نفسیاتی اور جذباتی رجحانات کی نمائندگی ہی نہیں کرتا بلکہ اس کی فکر کو مخصوص سمت و رفتار عطا کرنے میں بھی معاون و مددگار رہے۔

سرعتِ رفتار کے ساتھ تبدیل ہوتے ہوئے تہذیبی معاشرتی اور معاشی پس منظر میں عورت کا کردار بھی سرعت کے ساتھ بدل رہا ہے۔ اس کی توجہات اور ترجیحات تبدل پذیر ہے۔ مئی 2018 کے شمارے میں ابتدائی صفحات پر محمد قمر تبریز اور افروز عالم ساحل کے ذریعے جو بصیرت افروز انٹرویو اور ذہن کشا تفصیلات سیرت فاطمہ اور علمہ افروز کے حوالے سے پیش کی گئیں ہیں وہ شاہد ہیں کہ عورت اگر کشادگی ذہن کے ساتھ ارتقائے انسانی میں اپنا حصہ ادا کرے تو اپنی تہذیب وتمدن کی بھی اسی قدر حفاظت کرسکتی ہے۔ جتنی جدید علوم وفنون کے حصول میں وہ کدو کاوش کرتی ہے۔ یہ انٹرویو اور تفصیلات نئی نسل کے لیے حوصلہ افزا بھی ہیں اور لائق پیروی بھی۔

موجودہ دور میں اردو زبان عوام کے درمیان ایک بار پھر مقبولیت حاصل کر رہی ہے مگر عوام الناس کی بے خبری کے سبب غلط محاوروں کے استعمال جمع الجمع اور تلفظ کی غلطیاں بہ کثرت نظر آتی ہیں۔ رسالے میں فرہنگ آصفیہ سے محاورے اور قلت استعمال کے سبب غیر مانوس سے لگنے والے الفاظ اپنے وسیع تر معنی کے ساتھ پیش کیے جاتے ہیں، یہ ایک عمدہ طریقہ الفاظ سکھانے اور ان کے استعمال سمجھانے کا ہے۔

اکتوبر کا شمارہ گویا گاندھی نمبر ہے۔ مگر اس کا ایک مضمون 'اکتوبر کی تین بڑی شخصیات' از ڈاکٹر تسنیم بانو نہایت اہم ہے۔ اس کے ذریعہ ہم اپنے ان عظیم مفکروں کو بھی خراج عقیدت پیش کرنے کے جذبات اپنے دل میں بیدار پاتے ہیں۔

غذا اور حسن وصحت سے متعلق معلومات اہم ہیں اور دلچسپ بھی، میگزین کی ان تمام خوبیوں کے علاوہ اس میں بعض اضافوں کی ضرورت محسوس ہوتی ہے مثلاً تاریخی گوشہ جس میں رضیہ سلطانہ، چاند بی بی، رانی لکشمی بائی جیسی باہمت خواتین کا ذکر ہو خصوصاً تاریخ کی ان ماؤں کا جنھوں نے ملک کو نایاب شخصیتیں عطا کیں مگر آج ان کو شاید زمانہ فراموش کر چکا ہے۔

عورتوں کے حوالے سے نفسیاتی گفتگو اور روحانی بلندی حاصل کرنے کے لیے بھی کچھ مواد ہونا چاہیے۔ ہماری تاریخ میں جہاں رابعہ بصری اور میرا بائی جیسی غیر معمولی صفات رکھنے والی خواتین موجود ہیں ان کی فکر اور زندگی سے متعلق ان کے نظریات کا مطالعہ عورتوں کے لیے بہتر ثابت ہوگا اور نسوانی فکر کے افق کو وسعت بخشنے کا سبب بنے گا۔

ڈاکٹر فرحت نادر رضوی، جامعہ نگر، نئی دہلی

خواتین خبرنامہ

محنت مزدوری کرنے والی خواتین کو با اختیار بنانا ضروری: سید تحسین احمد

نئی دہلی 20 اکتوبر (پریس ریلیز) جن سیوا کے سہیلیاں گروپس کی جانب سے ’خواتین کی معاشی مضبوطی‘ کے موضوع پر ملی ماڈل پبلک اسکول ابوالفضل انکلیو دعوت نگر، جامعہ نگر دہلی میں پروگرام منعقد ہوا۔ جس

میں تقریباً125 خواتین شریک ہوئیں جو یا تو گھریلو خادمہ تھیں یا پھر محنت مزدوری کر کے اپنی فیملی کو چلاتی ہیں۔ اس پروگرام میں سوشل ورکرس بندنا پانڈے، راشدہ باقی، سیمہ اقبال ادا، ڈاکٹر ریحانہ، فرحت خانم نے شرکت کر کے محنت مزدوری کرنے والی خواتین کے معاشی حالات کیسے بہتر ہوں، اس کے لیے مشورہ اور اپنے تجربات کو پیش کرتے ہوئے انھیں حوصلہ دیا۔ جن سیوا دہلی برانچ کی ٹریزرر نے جن سیوا کے اغراض ومقاصد پر روشنی ڈالی۔ جن سیوا دہلی برانچ کے منیجر پرویز عالم نے جن سیوا کا تفصیلی تعارف کراتے ہوئے کہا کہ یہ ادارہ ہندوستان میں قانون کے دائرے میں ایک رجسٹرڈ ادارہ ہے جو غریبوں اور معاشی طور پر پریشان حال لوگوں کو سود کی لعنت سے بچانے کی کوشش کرتا ہے اور بلاسودی لون فراہم کرتا ہے۔ ساتھ ساتھ ایسے لوگوں کو بچت کی عادت ڈلوانے کی کوشش کرتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اب تک پورے ملک میں اس کی تقریباً36 شاخیں ہیں اور یہ کریڈٹ سوسائٹی تقریباً300 کروڑ کی ہے۔ جن سیوا سہیلیاں گروپ کے ذریعے خواتین کے معاشی مسائل پر خصوصی طور پر فوکس کرتا ہے اور ان کو چھوٹے موٹے لون آسان قسطوں پر بغیر سود کے فراہم کرتی ہے۔ الحمد اللہ اس کے ذریعہ ہزاروں کی تعداد میں خواتین کو فائدہ حاصل ہو رہا ہے۔ رہنما فائونڈیشن کے چیئرمین سید تحسین احمد نے کہا کہ یہ تنظیم آپ جیسی خواتین کو معاشرے میں معاشی اعتبار سے با اختیار بنانے کے ساتھ ساتھ انھیں ان کے واجب حقوق کی ادائیگی کے لیے کوشش کرتی ہے۔ چاہے وہ فصل کی کٹائی، بوائی ہو یا پھر دفتری کام کاج ہو یا پھر نوکری پیشہ یا پھر گھروں میں صفائی کا کام ہو۔ ہرمحاذ پر خواتین نے مردوں کا ساتھ دیا ہے اور دوہری ذمہ داری کو ادا کرنے میں کلیدی خدمات پیش کیں ہیں۔ جن سیوا تنظیم خواتین کو معاشی اعتبار سے مضبوط کرنے اور انھیں با اختیار کرنے کے ساتھ ساتھ انھیں بلاسودی قرض کی فراہمی کے لیے قائم کی گئی ہے۔ اس پروگرام کو رہنما فائونڈیشن اور خدائی خدمت گار نے مل کر آرگنائز کیا ہے۔

مدھیامک امتحان کے لیے ہاوڑہ کی 12 سالہ صائقہ بھی کوالیفائی

کلکتہ، 26 اکتوبر (اسٹاف رپورٹر): 12 فروری 2019 سے

شروع ہونے والے مدھیا مک امتحان میں ہاوڑہ میں آمتا کی 12 سالہ صائقہ خاتون نے اپنی تعلیمی صلاحیتوں کا مظاہرہ کر کے ریاستی مدھیامک پریکشا بورڈ سے امتحان میں بیٹھنے کی خصوصی اجازت حاصل کر لی ہے۔ مدھیامک بورڈ کے ضابطہ کے مطابق 31 اکتوبر 2004 کے بعد پیدا ہونے والے ریاستی مدھیامک امتحان میں شریک ہو سکتے

ہیں۔ مگر 11 برس کی عمر میں درجہ نہم کی تیاری مکمل کر لینے سے متاثر ہو کر صائقہ کے والد نے بورڈ سے درخواست کی کہ ان کی کمسن بیٹی کو مدھیامک امتحان میں شریک ہونے کا موقعہ دیا جائے۔ بورڈ کے حکام تک جب یہ درخواست پہنچی تو وہ بھی چونک پڑے کیونکہ مدھیامک امتحانات دینے کے لیے کم از کم 14 برس عمر ہونی چاہیے۔ مگر 12 فروری 2019 کو جب صائقہ پہلا پیپر حل کر رہی ہوگی تب اس کی عمر 12 برس تین ماہ ہوگی۔ تاہم مدھیامک بورڈ نے صرف درخواست ملنے پر ہی اسے مدھیامک امتحان میں بیٹھنے کی اجازت نہیں دے دی بلکہ وہ اس لائق ہے یا نہیں اسے جاننے کے لیے اس کا امتحان لیا۔ سات مضامین کے پرچے حل کر کے صائقہ نے 50% سے زیادہ نمبر حاصل کیے۔ بورڈ کے صدر نے بتایا کہ صائقہ کو صرف اس لیے امتحان دینے کی اجازت دی گئی تا کہ اگر ریاست میں کوئی بھی لڑکا یا لڑکی خود کو مدھیامک امتحان دینے کا اہل سمجھے تو وہ درخواست کر سکتا ہے اور امتحان دے کر سسٹم کے تحت اجازت حاصل کر سکتا ہے۔ ایسے امیدوار کی حوصلہ افزائی کرنا مناسب ہے۔

صائقہ نے ٹسٹ میں بنگلہ کے پرچہ میں 48، انگریزی میں 42، ریاضی میں 40، فزیکل سائنس میں 58، لائف سائنس میں 68، تاریخ میں 56 اور جغرافیہ میں 60 مارکس حاصل کر کے سب کو حیران کر دیا۔

یونیورسٹیز اور کالجز کی طالبات اپنی اہمیت کو سمجھیں

خواتین کے تحفظ اور سائبر کرائم سے متعلق باریکیوں پر جامعہ ملیہ میں منعقد سیمینار میں رجسٹرار کا خطاب

نئی دہلی، 26 اکتوبر (ایس این بی) لڑکیوں کو سائبر کرائم کے تئیں بیدار کرنے اور ان کے تحفظ کو مزید مضبوط بنانے کے لیے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں 'وومن سیفٹی اینڈ سائبر سیکورٹی' کے موضوع پر ایک سیمینار کا انعقاد کیا گیا جس میں ماہرین نے لڑکیوں کو سائبر کرائم اور دیگر تحفظات کو یقینی بنانے کے بارے میں تفصیلات فراہم کیں۔ اس موقع پر ماہرین نے بتایا کہ ایسی سرگرمیاں جس میں کمپیوٹر یا نیٹ ورکس ذرائع کو ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کرتے ہوئے کسی کو ہدف بنایا جائے یا اس کے ذریعہ مجرمانہ سرگرمیاں انجام دی جائیں جو یا تو غیر قانونی ہو یا انھیں مخصوص فریقین کی جانب سے خلاف قانون سمجھا جائے اور ان میں عالمی الیکٹرانک نیٹ ورکس کو استعمال کیا جائے سائبر کرائم کہلائیں گی۔

اے پی صدیقی (آئی پی ایس) مسجل جامعہ ملیہ اسلامیہ نے کہا کہ یونیورسٹیاں اور کالجز نوجوان ذہنوں کا مرکز ہوتے ہیں، جو اپنا کیریر اور مستقبل کی تعمیر کے لیے دور دراز کا سفر کر کے ان جگہوں کا رخ کرتے ہیں، ان کے اوپر یہ لازم ہے کہ وہ اپنی ذمہ داریوں کو سمجھیں اور ہر طرح

سے خود کو محفوظ اور مضبوط بنانے کا جتن کریں۔ لڑکیوں کو انھوں نے بطور خاص مشورہ دیتے ہوئے کہا کہ وہ اپنی اہمیت کو خود سمجھیں اور ایسا کام نہ کریں جو ان کے مستقبل کے لیے مصیبت بنے، انھوں نے کہا کہ لڑکیاں جدید سہولتوں کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ان اقدامات اور تحفظات کو بروئے کار لائیں جو ان کی حفاظت اور ترقی کے لیے بنائے گئے ہیں، انھوں نے تعلیم کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ فرسودہ خیالات کو پیچھے چھوڑیں اور تعلیم سے لیس ہو کر صحت مند سماج کے فروغ میں اپنا حصہ ادا کریں۔

اپنے گھر سے تبدیلی لانے کے لیے اقدام کرنے پر زور دیتے ہوئے ایڈیشنل ڈی سی پی ہریش نے کہا کہ معاشرہ میں سدھار لانے کے لیے اپنے گھر سے تبدیلی کی کوشش کرنی ہوگی۔

اس موقع پر سائبر کرائم کی ماہر اور قانون داں انو پریہ نے انٹرنیٹ کے محفوظ استعمال پر گفتگو کرتے ہوئے انٹرنیٹ کے استعمال میں لاپروائی کے حوالے سے اس کے نقصانات پر روشنی ڈالی۔

گھنشام بنسل ایڈیشنل ڈی سی پی ساؤتھ دلی نے کہا کہ موجودہ دور میں سوشل میڈیا کی اہمیت سے بالکل بھی انکار نہیں کیا جاسکتا لیکن ضرورت اس امر کی ہے کہ اس حوالے سے نوجوانوں کو مکمل آگاہی فراہم کی جائے تاکہ مستقبل میں کسی قسم کے ناخوشگوار واقعے سے بچا جاسکے۔

اس پروگرام کا انعقاد معروف ہندی روزنامہ نو بھارت ٹائمز اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے دفتر برائے تعلقات عامہ اور میڈیا کو آرڈی نیشن آفس کے اشتراک سے عمل میں آیا۔

□□□

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

اردو لوک ناٹک: روایت اور اسالیب (حصہ اوّل)

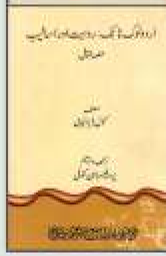

مصنف: کنول ڈبائیوی

ترتیب و ترمیم: پروفیسر ابن کنول

صفحات: 482

قیمت: 170 روپے

حفظانِ صحت

ادارہ

صفحات: 682

قیمت: 285 روپے

جدید ہندی شاعری پر اردو کا اثر

مصنف: ڈاکٹر نریش

صفحات: 155

قیمت: 90 روپے

ملاقاتیں (مشاہیر کے انٹرویو)

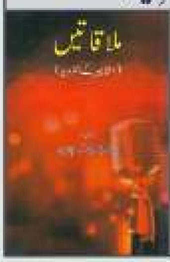

ترتیب: پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین

صفحات: 578

قیمت: 241 روپے

فرہنگ ادبیات (لسانی و ادبی اصطلاحات کا توضیحی و تنقیدی مطالعہ)

مصنف: سلیم شہزاد

صفحات: 831

قیمت: 345 روپے

عروجِ فن کلیات خلیل الرحمٰن اعظمی

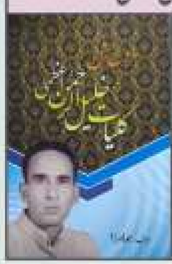

مرتب: ہما مرزا

صفحات: 260

قیمت: 145 روپے

فدائے لکھنؤ

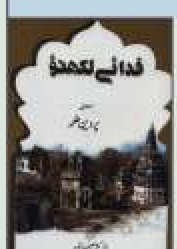

مصنفہ: پروین طلحہ

مترجم: ڈاکٹر صبیحہ انور

صفحات: 182

قیمت: 100 روپے

سماجی تحقیق

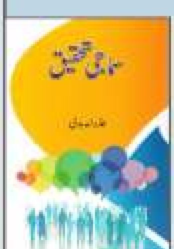

مصنف: عذرا عابدی

صفحات: 490

قیمت: 215 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Mahnama Khawateen Duniya Monthly December 2018, Vol. 02, Issue: 12 RNI. No. DELURD/2017/74026
ISSN 2581-4826
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے
مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے
(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

منگانے کے لیے رابطہ کریں:
شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 Institutional Area Jasola New Delhi-110025